www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

November 2013 • No. 444 • Rs. 15

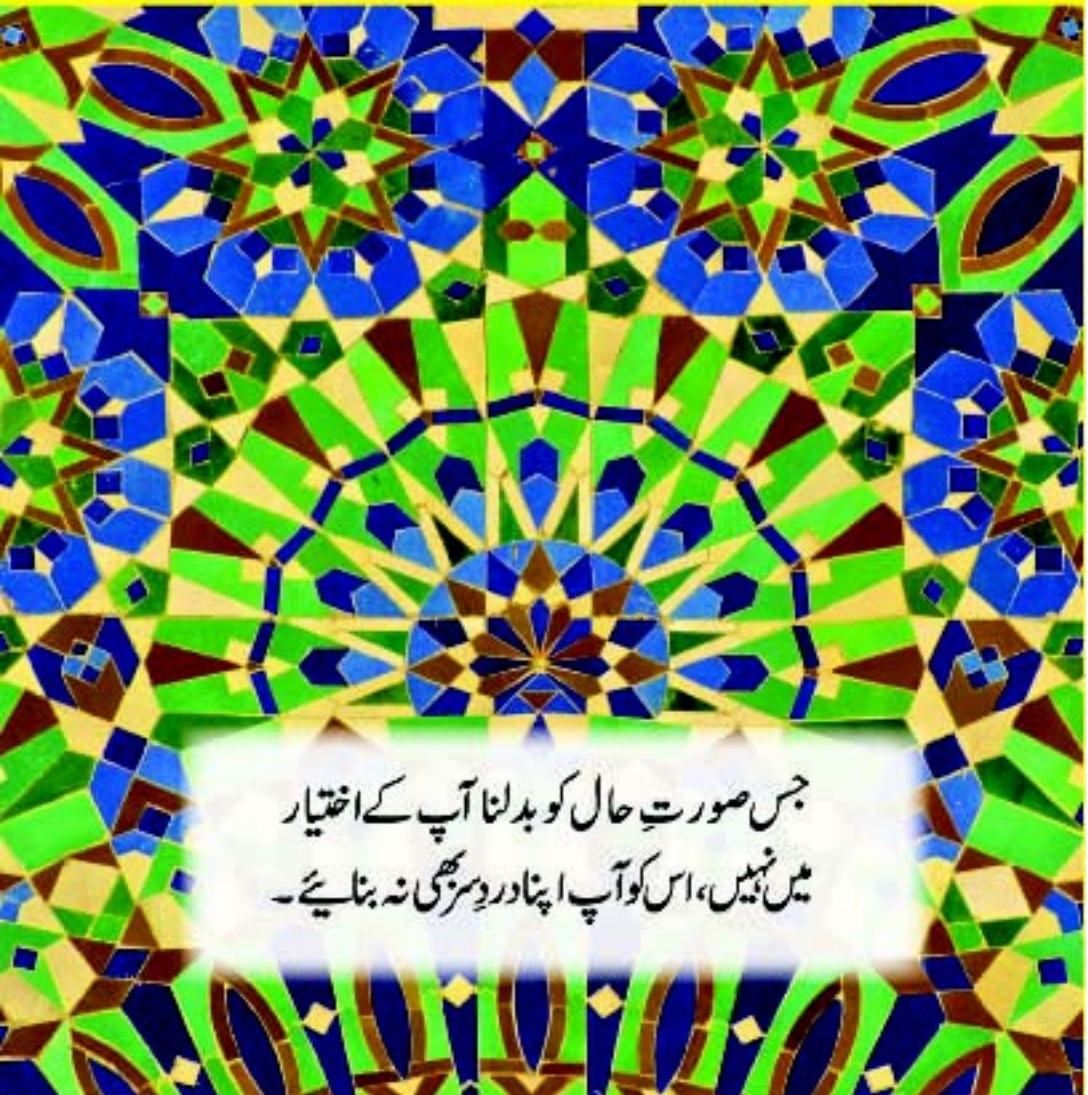

جس صورتِ حال کو بدلنا آپ کے اختیار
میں نہیں، اس کو آپ اپنا دردِ سر بھی نہ بنایئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

نومبر 2013

فہرست

قرآن ایک جامع ہدایت	2
تعاہد کیا ہے	3
دورِ جدید میں سیرت نگاری	4
مغرب کا کیس	5
ایک حکیمانہ اصول	6
اجتہاد کی اہمیت	9
منصوبۂ خداوندی	13
اسلام کا انقلابی رول	21
اسلام اور جنگ	27
قانونِ شریعت کا نفاذ	32
خودکشی کا بڑھتا ہوا رجحان	36
مس ورلڈ	37
خودکشی کیوں	38
کسی کی انا کو مت چھیڑیے	39
سوال و جواب	40

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Mob. 8588822679, 8588822680
Tel. 011-46521511, 41827083,
Fax: 011-45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹15
One year ₹150
Two years ₹ 300
Three years ₹ 450

By Registered Mail:
One year ₹400
Two years ₹ 800
Three years ₹1200
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

قرآن ایک جامع ہدایت

قرآن کی سورہ النحل میں قرآن کی ایک خصوصیت اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (16:89) یعنی ہم نے تم پر الکتاب اتاری ہے جس میں ہر چیز کا کھلا بیان ہے۔ اور ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے فرماں برداروں کے لیے۔

'تبیانًا لکل شيء' کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے — مقصدِ قرآن کی نسبت سے ہر چیز کا بیان۔ اِس سے مراد عام انسانی فہرست نہیں ہے، بلکہ اِس سے اُس دین کی فہرست ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ مشہور عربی لغت لسان العرب میں اِس کی توضیح اِن الفاظ میں کی گئی ہے: بُين لك فيه كلُّ ما تحتاج إليه أنت وأمتك من أمر الدين (68/13) یعنی قرآن میں اُن تمام چیزوں کو بیان کر دیا گیا ہے جو امرِ دین کی نسبت سے تمھارے لیے اور تمھاری امت کے لیے ضروری ہیں۔

جو لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ قرآن میں تمام سائنسی مضامین اور تمام عمرانی علوم (social sciences) موجود ہیں، وہ اس سے بے خبر ہیں کہ قرآن کا مقصد نزول کیا ہے۔ قرآن اِس لیے نہیں اتارا گیا ہے کہ وہ انسان کو تمام دنیوی علوم سے واقف کرائے۔ حدیث میں واضح طور پر اس کی تردید موجود ہے۔ تابیرِ نخل کے واقعے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس معاملے کو ایک جامع اصول کے طور پر اِن الفاظ میں بیان کیا ہے: أنتم أعلم بأمر دنياكم (صحيح مسلم، رقم الحديث: 6277)

اصل یہ ہے کہ قرآن اِس لیے اتارا گیا ہے کہ وہ انسان کو اس کی ابدی فلاح کے معاملے میں رہنمائی دے۔ اِس ابدی فلاح کا تعلق آخرت کی فلاح سے ہے۔ قرآن میں اُن رہنما اصولوں کو بتایا گیا ہے جن کی پیروی کر کے انسان آخرت کی ابدی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ جہاں تک دنیوی معاملات کا تعلق ہے، اس کے بارے میں انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنی تحقیق اور تجربے کے ذریعے اُن کو معلوم کرے۔

تعاہد کیا ہے

قرآن کے بارے میں ایک روایت اِن الفاظ میں آئی ہے: عن أبي موسى عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: تعاهدوا القرآن، فوالذي نفسي بيده لهو أشد تفصيًا من الإبل في عقلها (صحيح البخاري، رقم الحديث: 5033) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم قرآن کی حفاظت کرو، کیوں کہ قرآن اُس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ نکل جانے والا ہے جس طرح اونٹ اپنی رسی سے چھوٹ کر نکل جاتا ہے۔

اِس حدیث میں قرآن کی حفاظت (تعاہد) سے مراد اس کی لفظی حفاظت نہیں ہے، بلکہ اس کی معنوی حفاظت ہے۔ ''تعاہد'' کا مطلب یہ ہے کہ تم قرآن کو مسلسل طور پر اپنی سوچ کا مرکز بنائے رہو، تمھارے اندر قرآن رخی تفکیر (Quran-oriented thinking) پیدا ہوجائے، تم ہمیشہ قرآن میں نئے نئے معانی تلاش کرتے رہو، تم قرآن کو مسلسل طور پر اپنے ذہن کا حصہ (intellectual part) بنالو۔ قرآن کے معانی، بہ الفاظِ دیگر، قرآنی طرزِ فکر، ایک ایسی چیز ہے جو صرف اُس وقت آدمی کے ذہن کا حصہ بنتا ہے جب کہ آدمی اس پر مسلسل طور پر سوچے، جب کہ وہ اس کے تفکیری عمل (thinking process) کا مستقل جز بنا ہوا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو قرآن بہت جلد فراموشی کے خانے میں چلا جائے گا۔ وہ آدمی کے زندہ حافظہ (living memory) میں باقی نہ رہے گا۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زندگی میں آدمی ہر لمحہ مسائلِ دنیا سے دوچار رہتا ہے۔ طرح طرح کے دنیوی تقاضے ہر لمحہ آدمی کو اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ قرآن مکمل طور پر ایک کتاب آخرت ہے، جب کہ انسان مکمل طور پر ایک دنیوی مخلوق ہے۔ یہی وہ فرق ہے جس کی طرف مذکورہ حدیث رسول میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اِس صورتِ حال میں کسی مومن کے لیے صاحبِ قرآن بننے کی شرط صرف ایک ہے، وہ یہ کہ وہ اپنے اندر تجریدی فکر (detached thinking) کی صلاحیت پیدا کرے۔ وہ ایک غیر قرآنی دنیا میں قرآنی ذہن کے ساتھ رہ سکے۔

دورِ جدید میں سیرت نگاری

موجودہ زمانے میں مسلم اہلِ قلم کے درمیان ایک موضوع بہت مقبول ہوا ہے۔ اِس موضوع کو عام طور پر ''دورِ جدید میں سیرت نگاری'' کہا جاتا ہے۔ مگر اِس موضوع پر جو کتابیں چھپی ہیں، اُن کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے مصنفین اِس بات سے بے خبر ہیں کہ دورِ جدید میں سیرت نگاری کا مطلب کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل موضوع سے اِن کتابوں کا کوئی تعلق نہیں۔

اِس موضوع پر شائع شدہ کتابوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن کے لکھنے والوں نے کچھ مغربی مصنفین کو اسلام کا دشمن فرض کرلیا اور یہ سمجھا کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو ''مسخ'' کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اِس مفروضے کے تحت انھوں نے بطور خود اِن ''اسلام دشمنوں'' کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ اِسی جوابی سیرت نگاری کو وہ بطور خود ''دورِ جدید میں سیرت نگاری'' سمجھتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ ایک بالکل نیا زمانہ ہے۔ پچھلے دور کو اگر روایتی دور کہا جائے تو موجودہ دور کو سائنسی دور کہا جائے گا۔ اب سیرتِ رسول کے اعتبار سے، یہ ضرورت ہے کہ سیرت کو اِس طرح لکھا جائے کہ وہ دورِ جدید سے پوری طرح متعلق (relevant) نظر آئے۔ موجودہ زمانے کی اصل ضرورت سیرتِ رسول کا یہی ریلونس (relevance) ثابت کرنا ہے، نہ کہ مفروضہ مخالفینِ اسلام کا جواب دینا۔

دورِ جدید میں سیرت نگاری ایک اجتہادی موضوع ہے، وہ کوئی روایتی یا تقلیدی موضوع نہیں۔ اس کام کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف، جدید ذہن کا مطالعہ خالص غیر جانب دارانہ انداز میں کیا جائے اور دوسری طرف، پیغمبر اسلام کی سیرت کو گہرے مطالعے کے ذریعے دوبارہ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ راقم الحروف کے مطالعے کے مطابق، مغربی مصنفین، اسلام یا پیغمبر اسلام کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ اُن کا طریقِ مطالعہ (method of study) مختلف ہے۔ مسلمان اگر سیرت کا مطالعہ خوش عقیدگی کے ذہن کے تحت کرتے ہیں تو مغربی مصنفین اس کا مطالعہ موضوعی (objective) انداز میں کرتے ہیں۔ اِسی فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمان اِس معاملے میں غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں۔

مغرب کا کیس

ڈاکٹر صہیب حسن (لندن) کا ایک مضمون ایک عرب شیخ صالح الحُصیّن (وفات: 2013) کے بارے میں چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے مغربی تہذیب یا مغرب کے بارے میں شیخ صالح الحصین کا نقطۂ نظر بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ — اگر ایک مسلمان کو اہلِ مغرب پر تنقید کرنا ہے تو وہ صرف اُن کے عیوب پر تنقید کرے۔ اہلِ مغرب کی خوبیوں کا نہ صرف اعتراف کرنا چاہئے، بلکہ اس میں ہمیں اُن سے مسابقت کرنا چاہئے اور اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اسلام میں عدل ہر قیمت پر مطلوب ہے۔ (ماہ نامہ 'صراطِ مستقیم'، ستمبر 2013، صفحہ 25، برمنگھم، لندن)

عرب شیخ کے اِس ملفوظ میں غالباً اہلِ مغرب کی اخلاقی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں اور بھی ایسے کئی لوگ ہیں جو انفرادی سطح پر اہلِ مغرب کی اخلاقی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کا اعتراف ایک کم تر اعتراف ہے۔ اہلِ مغرب کی دوسری اِس سے زیادہ بڑی دین ہے جس کو غالباً مسلم علما نہ جانتے ہیں اور نہ وہ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

اہلِ مغرب کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ دینِ اسلام کے لیے مُؤید (supporter) کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ اِس دین کی تائید سیکولر لوگوں کے ذریعے بھی کرے گا۔ تائید دین کا یہ کام سب سے زیادہ اہلِ مغرب کے ذریعے انجام پایا ہے۔ حدیث میں تائید دین کے جس واقعے کی پیشین گوئی کی گئی ہے، بلاشبہہ اہلِ مغرب سب سے زیادہ اس کے مصداق ہیں۔

اہلِ مغرب نے پہلی بار فطرت (nature) میں چھپی ہوئی اُن حقیقتوں کو دریافت کیا جو اعلیٰ معرفت کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اہلِ مغرب کی سائنسی دریافتوں نے تاریخ میں پہلی بار اِس بات کو ممکن بنایا ہے کہ اسلام کے نظریات کو خالص علم انسانی کی سطح پر ثابت شدہ بنایا جا سکے۔ یہ اہلِ مغرب تھے جو دنیا میں پہلی بار کامل معنوں میں مذہبی آزادی کا دور لائے۔ ماڈرن کمیونکیشن غیر مشترک طور پر اہلِ مغرب کا عطیہ ہے، جس نے اسلام کی عالمی اشاعت کو ممکن بنا دیا ہے، وغیرہ۔

ایک حکیمانہ اصول

سلمان فارسی، اصفہان (ایران) میں پیدا ہوئے، پھر وہ مدینہ آئے۔ یہاں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ان کی وفات مدائن (ایران) میں 35 ہجری (655 عیسوی) میں ہوئی۔

ہجرت کے پانچویں سال وہ واقعہ پیش آیا جس کو عام طور پر غزوہ خندق کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ مکہ کے سرداروں نے مختلف قبائل کے تعاون سے ایک بڑا لشکر تیار کیا ہے۔ اس کے افراد کی تعداد دس ہزار ہے۔ یہ لشکر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے مکہ سے روانہ ہو چکا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب معمول مدینہ میں اپنے اصحاب کو جمع کیا اور اُن سے مشورہ کیا کہ اِس طرح کی صورت حال میں ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ بات واضح تھی کہ مسلمان اُس وقت اتنے بڑے لشکر سے جنگی مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ اِس لیے سوال یہ تھا کہ اِس لشکر سے مقابلے کے لیے جنگ کے سوا دوسری کون سی تدبیر اختیار کی جائے۔

اُس وقت سلمان فارسی کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میرا تعلق فارس (ایران) سے ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ فارس کے حکمراں جب دشمن سے ٹکراؤ کرنا نہیں چاہتے تو وہ اپنے اور دشمن کے درمیان ایک خندق کھود دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس تجویز کو پسند فرمایا اور مدینے کے تمام قابلِ کار مسلمان خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے، یہاں تک کہ 6 دن کی لگاتار محنت کے بعد خندق تیار ہو گئی۔ مدینہ اُس وقت تین طرف سے پہاڑوں اور کھجور کے گھنے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ اِس لیے اِس سمت سے حملہ آور فوج مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ مدینہ کا شمال مغربی حصہ خالی تھا۔ اِس سمت سے کوئی فوج حملہ آور ہو سکتی تھی۔ مدینے کے اِسی کھلے ہوئے حصے کی طرف خندق کھودی گئی۔ اِس خندق کی چوڑائی اور گہرائی تقریباً تین تین میٹر تھی۔ اس کی لمبائی 6 میل (10 کیلومیٹر) تھی۔

اہلِ مکہ کی اِس حملہ آور فوج کے سردار ابوسفیان تھے جو بعد کو اسلام میں داخل ہو گئے۔ دس ہزار کا

یہ لشکر جب سفر کرتے ہوئے مدینہ کی سرحد پر پہنچا تو اس وقت تک خندق کھودی جا چکی تھی۔ اہلِ مکہ کا یہ لشکر اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار تھا۔ قدیم زمانے میں بظاہر اُن کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ خندق کو پار کرکے مدینہ کے اندر داخل ہوجائیں۔ چناں چہ جب وہ مدینہ کی سرحد پر پہنچے اور خندق کو دیکھا تو انھوں نے کہا: واللہ إن ھذہ لمکیدۃ ما کانت العرب تکیدھا (بخدا، یہ ایک ایسی تدبیر ہے جس تدبیر سے اہلِ عرب باخبر نہ تھے)۔

یہ خندق، دوسرے لفظوں میں، اُس وقت ایک حاجز (buffer) کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ایک ایسی تدبیر تھی جس نے اہلِ اسلام اور ان کے مخالفوں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور آڑ قائم کردی تھی۔ چناں چہ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین کا لشکر مدینہ کے باہر تقریباً ایک مہینہ تک پڑاؤ ڈالے رہا۔ وہ اپنے مقام سے مسلمانوں کو آواز دیتے تھے کہ تم مدینہ سے باہر آؤ، مگر مسلمان باہر نہیں آئے۔ آخر کار مخالفین کا یہ پورا لشکر مایوس ہوکر واپس چلا گیا۔

ایک ابدی اصول

خندق کا یہ واقعہ صرف ایک تاریخی واقعہ نہیں، وہ زندگی کا ایک ابدی اصول ہے۔ انفرادی زندگی کا بھی اور اجتماعی زندگی کا بھی۔ وہ اصول یہ ہے کہ اگر کوئی فرد یا گروہ تمھارا مخالف بن جائے تو اس سے ٹکراؤ نہ کرو، بلکہ ٹکراؤ کے بجائے تدبیر کا راستہ اختیار کرو۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ اپنے اور حریف کے درمیان ایک آڑ (buffer) قائم کردو۔ اِس طرح پیش آمدہ مسئلہ اپنے آپ ختم ہوجائے گا۔ جس مسئلے کو تم ٹکرا کر ختم کرنا چاہتے ہو، وہ مسئلہ ٹکراؤ کے بغیر خود حالات کے نتیجے میں ختم ہوجائے گا، جیسا کہ خود غزوۂ خندق کے موقع پر ہوا۔

اِس حاجز یا آڑ کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ قدیم زمانے میں حاجز قائم کرنے کے لیے دیوار بنانا یا خندق کھودنا پڑتا تھا۔ موجودہ زمانے میں نئے وسائل کی دریافت نے اِس تدبیر کی نئی نئی صورتیں پیدا کی ہیں۔ آدمی اگر صورتِ حال پر مشتعل ہونے کے بجائے سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو آسانی کے ساتھ وہ موقع کے لحاظ سے ایک کامیاب تدبیر دریافت کرسکتا ہے۔

اِس معاملے کی ایک تاریخی مثال یہ ہے کہ 1950 کے بعد مصر اور مغربی طاقتوں کے درمیان کشیدگی بڑھی، یہاں تک کہ اُس وقت کے مصری صدر جمال عبد الناصر کے ذہن میں انتہا پسندانہ خیالات آنے لگے، چناں چہ انھوں نے یہ ناعاقبت اندیشانہ اقدام کیا کہ اقوامِ متحدہ کی طرف سے مصر میں مقرر کیے ہوئے پیس کیپنگ فورس (peace-keeping forse) کے دستے کو واپس کر دیا۔ پیس کیپنگ فورس کی حیثیت اُس وقت فریقین کے درمیان بفر (buffer) کی تھی۔ اس کو واپس بھیجنا بفر کو ختم کرنے کے ہم معنی تھا۔

اس کے بعد 29 اکتوبر 1956 کو جمال عبد الناصر نے تالیوں کی گونج کے درمیان اعلان کیا کہ آج ہم نے نہر سوئز (Suez Canal) کو نیشنلائز کر لیا ہے۔ یہ اعلان بین الاقوامی اصول کے سرتاسر خلاف تھا۔ فطری طور پر فریقِ ثانی کے درمیان اِس کا سخت ردِّعمل ہوا۔ اِس کے بعد حالات بہت خراب ہو گئے، یہاں تک کہ جون 1967 کی 6 روزہ جنگ پیش آئی، جس کے بعد مصر اور فلسطین کا بڑا حصہ اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔

القرآن مشن، کشمیر

کشمیر میں موجود دعوتی مواقع کو استعمال کرنے کے لیے ایک منظم دعوتی مہم چلائی جا رہی ہے۔
جو حضرات اِس پروگرام میں شامل ہونا چاہتے ہیں، وہ حسب ذیل پتے پر رابطہ کریں:

Al-Quran Mission, Kashmir
Email: kwc.beerwah@gmail.com, Mob. 9419488008

دعوتی مقصد کے لیے مشرقی یوپی، خاص طور پر لکھنؤ اور اطراف کے قارئین، حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم کریں:

Hafiz Mohammad Salman Noori
Madrasa S. Umar Farooq, Rustam Nagar,
Chawk, Lucknow-226 003
Mob. +91-9839801027, E-mail: msuflko@gmail.com

اجتہاد کی اہمیت

اجتہاد کا لفظی مطلب ہے— بھرپور کوشش کرنا (بذل الوسع في طلب الأمر)۔ شرعی اصطلاح میں، اجتہاد کا مفہوم یہ ہے کہ نئی صورتِ حال میں اسلام کے کسی اصول کے عملی انطباق کو جاننے کے لیے کامل فکری جدوجہد کی جائے۔ یہ اجتہاد ایک فطری ضرورت ہے۔ وہ ہر حال میں جاری رہتا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اجتہاد کا عمل صحابہ کے درمیان جاری تھا اور بعد کو وہ امت کے اندر مسلسل طور پر جاری رہا۔

دورِ جدید ہر اعتبار سے ایک بدلا ہوا دور تھا۔ فطری طور پر اِس دور میں مسلمانوں کے لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ نئے حالات میں اسلام کے اصول کو ازسرِ نو منطبق کریں۔ یہ ایک اجتہادی تقاضا تھا، مگر دورِ جدید کے مسلم اہلِ علم اِس اجتہاد میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ وہ نئے حالات کی نسبت سے، اسلامی اصولوں کا ازسرِ نو انطباق (re-application) تلاش نہ کر سکے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں امتِ مسلمہ کا بحران (crisis) کہا جاتا ہے۔ بحران کیا ہے۔ بحران دراصل مسئلہ (problem) ہی کا دوسرا نام ہے۔ مسئلہ زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ جب کسی پیش آمدہ مسئلے کو حل کرلیا جائے تو وہ صرف مسئلہ رہے گا، اور اگر مسئلہ اتنا پیچیدہ ہو کہ وہ بظاہر ایک غیر حل شدہ مسئلہ (unsolved problem) نظر آنے لگے تو اِسی کا دوسرا نام بحران ہے۔ موجودہ زمانے میں امتِ مسلمہ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اِسی قسم کے بحران میں مبتلا ہوگئی ہے۔

اسلام کا آغاز 610 عیسوی میں عرب میں ہوا۔ وہ بہت تیزی سے پھیلا اور صرف نصف صدی کے عرصے میں اس نے ایک عالمی حیثیت حاصل کرلی۔ پہلے مسلمانوں کی مقامی حکومتیں قائم ہوئیں۔ عباسی دور میں مسلمان ایک مسلم ایمپائر قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ سیاسی اقتدار کا یہ دور مختلف قسم کے نشیب وفراز کے ساتھ تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ مسلمانوں کے سیاسی عروج کی انتہا اور ان کے سیاسی زوال کا نقطۂ آغاز اگر متعین کرنا ہو تو وہ 1799 قرار پائے گا۔ مسلم دنیا میں 1799 میں دو بڑے واقعات

پیش آئے۔ایک واقعہ بحرِ روم (Mediterranean Sea) میں پیش آیا، اور دوسرا واقعہ میسور (انڈیا) میں۔ایک طرف، یہ ہوا کہ یورپی حکومتوں نے 1799 میں ترکی کے طاقت ور بحری بیڑا (naval fleet) پر حملہ کر کے اس کو بحرِ روم میں تباہ کر دیا۔یہ واقعہ اتنا بڑا تھا کہ اُس وقت کے انگریز جنرل نے انتہائی خوشی کے عالم میں کہا تھا کہ — آج انڈیا ہمارا ہے (Today India is ours)۔

اِس کے بعد رفتہ رفتہ تمام مسلم ملکوں میں مغربی طاقتوں کا دبدبہ قائم ہوگیا۔عین اُسی زمانے میں مسلم دنیا میں جوابی تحریکیں شروع ہوئیں۔عرب سے عجم تک ہر جگہ مسلم رہنما حرکت میں آ گئے۔اِن تمام مسلم رہنماؤں کا مشترک نشانہ صرف ایک تھا، اور وہ تھا مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ (past glory) کو واپس لانا۔یہ جدوجہد انیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوئی۔اب وہ اکیسویں صدی میں پہنچ چکی ہے، لیکن نتیجہ (result) کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلم رہنماؤں کی کوشش نے صرف مسلمانوں کی تباہی میں اضافہ کیا، وہ کسی بھی درجے میں اپنے مطلوب نشانے کو پورا نہ کر سکے۔

دورِ جدید میں مسلمانوں کے لیے جو مسئلہ پیدا ہوا، اس کے مقابلے میں کامیاب منصوبہ بندی کے لیے پہلی ضرورت یہ تھی کہ مسئلے کی نوعیت کو دریافت کیا جائے۔مگر اِس دور کے مسلم رہنما اِس پہلو سے مکمل طور پر بے خبر رہے۔اپنے روایتی ذہنی کے مطابق، انھوں نے اِس مسئلے کو دشمن کے حملے کے مقابلے میں، دفاع کا مسئلہ سمجھا، حالاں کہ وہ بدلے ہوئے حالات میں نئے اجتہاد کا مسئلہ تھا۔نوعیتِ مسئلہ کی دریافت میں مسلم رہنماؤں کی ناکامی نے اُن کی جوابی کارروائی کو مکمل طور پر ایک غیر متعلق کارروائی کا درجہ دے دیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ دوسو سال کی جان و مال کی عظیم قربانی کے باوجود نتیجہ (result) کے اعتبار سے، امتِ مسلمہ کو کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔

دورِ جدید میں جو اجتہاد درکار تھا، وہ بنیادی طور پر وہی تھا جس کو 'فرقان' (8:29) کہا گیا ہے، یعنی ایک معاملے کو دوسرے معاملے سے الگ کرنا۔امتِ مسلمہ کا اصل مشن دعوت الی اللہ ہے۔یہی وہ کام ہے جس کے بارے میں یہ مطلوب ہے کہ امتِ مسلمہ اس کو ہر حال میں جاری رکھے۔اِس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو سیاسی اقتدار کہا جا سکتا ہے۔دعوت الی اللہ، امتِ مسلمہ کا مشن ہے، اور سیاسی اقتدار،

امتِ مسلمہ کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمان جس بحران کا شکار ہو گئے تھے، اس کا واحد حل یہ تھا کہ مشن اور تاریخ کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے، مگر ہمارے رہنما بروقت یہ کام نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امت مسلسل طور پر بحران کی حالت میں پڑی رہی۔

موجودہ زمانے میں بہت سے نئے امکانات پیدا ہوئے تھے۔ یہ امکانات یا مواقع اسلام کے مشن کے اعتبار سے بے حد مفید تھے۔ مگر مسلم رہنماؤں پر سیاسی ذہن کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ اِن غیر سیاسی مواقع کو دیکھ نہ سکے۔ وہ دوسری قوموں سے بے فائدہ سیاسی لڑائی لڑتے رہے اور جدید مواقع کو دعوتی مشن کے لیے استعمال کرنے میں ناکام رہے۔

اِس معاملے کی ایک متوازی مثال یہ ہے کہ عین اسی زمانے میں مسیحی چرچ بھی عین اِسی قسم کے بحران میں مبتلا ہوا۔ مسیحی چرچ جس کا مرکز روم تھا، وہ قدیم زمانے میں تقریباً پورے یورپ میں ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس زمانے میں پوپ (pope) یورپ کا پولٹکل ماسٹر بنا ہوا تھا۔

اس زمانے میں یورپ کے سائنس دانوں نے طبیعی دنیا میں نئی حقیقتیں دریافت کیں۔ یہ دریافتیں مسیحی طرز کے روایتی عقائد سے ٹکراتی تھیں۔ چناں چہ سائنس دانوں اور مسیحی چرچ کے درمیان شدید ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ اِس تصادم کی تفصیل اِس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے:

History of the Conflict Between Religion and Science by William Draper

اِس مسئلے میں مسیحی چرچ نے حقیقت پسندانہ طریقہ اختیار کیا۔ وہ چرچ اور اسٹیٹ کی عملی علاحدگی پر راضی ہو گئے۔ مگر یہ علاحدگی سادہ طور پر مذہب اور سیاست کی علاحدگی کے ہم معنی نہ تھی، بلکہ وہ سیاسی محدودیت کے ہم معنی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ پوپ مسیحی ایمپائر کا رقبہ گھٹا کر اس پر راضی ہو گیا کہ اس کا دائرہ اختیار روم کے ایک چھوٹے رقبے تک محدود رہے، جس کو ویٹکن (Vatican) کہا جاتا ہے۔ ویٹکن پورے معنوں میں ایک خود مختار ریاست ہے۔ اس کا اپنا آزادانہ نظام ہے۔ ہر ملک میں اس کے سفارت خانے قائم ہیں۔

ویٹکن کی صورت میں ایک محدود مسیحی ریاست کا یہ قیام 1929 میں پیش آیا۔ یہ معاملہ مسیحی پوپ اور حکومتِ اٹلی کے درمیان ایک معاہدہ کے ذریعے انجام پایا۔ اِس معاملے کو لیٹران معاملہ (Lateran Treaty) کہا جاتا ہے۔ اِس معاہدے پر حکومت اٹلی کی طرف سے اُس وقت کے پریمیر (premier) مسولینی (Benito Mussolini) نے دستخط کئے تھے، اور مسیحی چرچ کی طرف سے کاردینال گاسپیری (Cardinal Gasparri) نے اپنے دستخط کئے تھے۔ اِس معاہدے کے ذریعے مسیحی چرچ نے اپنی حیثیت کو بدستور برقرار رکھا۔ یہ بلاشبہہ ایک دانش مندانہ تدبیر تھی جو اُسی قسم کے ایک تخلیقی فکر پر مبنی تھی جس کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے، موجودہ زمانے کے مسلم رہنما اِس قسم کا اجتہاد نہ کر سکے۔ چناں چہ موجودہ زمانے میں انھوں نے صرف ناکامی کی تاریخ بنائی، وہ کامیابی کی تاریخ نہ بنا سکے۔

موجودہ زمانے میں اِسی قسم کے ''فرقان'' کا ایک واقعہ سیکولر اعتبار سے پیش آیا۔ اِس واقعے کا تعلق چین (China) سے ہے۔ چین میں 1919 سے کمیونسٹ پارٹی کی حکومت قائم ہے۔ کمیونسٹ پارٹی نے اپنے نظریے کے مطابق، وہاں اسٹیٹ اکانمی (state economy) کا نظام قائم کر رکھا تھا۔ اِس نظام کے تحت چین کی اقتصادی ترقی رک گئی تھی۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی کا ایک رکن ڈینگ زیو پنگ (Deng Xiaoping) تھا۔ پہلے اس نے روس میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے فرانس گیا۔ فرانس کے قیام کے دوران اُس نے دیکھا کہ فرانس میں اقتصادی ترقی ہو رہی ہے، لیکن چین اُس قسم کی ترقی سے محروم ہے۔ فرانس سے واپسی کے بعد ڈینگ زیو پنگ چین کی کمیونسٹ پارٹی کا چیرمین بن گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک انقلابی کام کیا۔ اس نے چین میں سیاست اور اقتصادیات کے درمیان علاحدگی کا اصول رائج کیا۔ اس نے یہ کیا کہ سیاسی اقتدار پر کمیونسٹ پارٹی کا قبضہ باقی رکھتے ہوئے اقتصادیات کو مکمل طور پر آزاد کر دیا۔ اِس دانش مندانہ تدبیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین میں اقتصادی ترقی کا دروازہ کھل گیا۔ آج یہ حال ہے کہ امریکا کے بعد چین دنیا کی دوسری سب سے بڑی اکانمی سمجھا جاتا ہے۔ (2012)

منصوبۂ خداوندی

بارش کے موسم میں بارش ہوتو یہ اِس بات کا ایک خاموش اعلان ہوتا ہے کہ کسان اٹھیں اور اپنے کھیتوں میں کام کرکے اُن میں بیج ڈالیں، تاکہ کھیتوں سے سرسبز وشاداب فصل اگے۔ لیکن کسان اگر ایسا کرے کہ وہ اپنے گھر سے نکل کر پہاڑ کی طرف جائے اور وہاں وہ کوہ پیمائی (mountaineering) کرنے لگے۔ کوئی انسان اگر ایسا کرے تو کوششوں اور قربانیوں کے باوجود وہ کوئی نتیجہ حاصل نہ کرسکے گا، کیوں کہ وہ خالق کی مرضی کے خلاف چل رہا ہے۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین کے معاملہ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے امکانات کھولے جاتے ہیں۔ اہلِ ایمان کا کام ہوتا ہے کہ وہ اِن امکانات کو پہچانیں اور اُن کو بھرپور طور پر استعمال (avail) کریں۔ اگر اہلِ ایمان ایسا کریں کہ اللہ نے امکانات تو کہیں اور کھولے ہوں، لیکن اہلِ ایمان کسی دوسرے محاذ پر کوشش شروع کردیں۔ اہلِ ایمان اگر ایسی غلطی کریں تو خواہ وہ کتنی ہی قربانیاں دیں، مگر اس کا کوئی نتیجہ ہرگز برآمد نہیں ہوگا۔ ایسے لوگ قرآن کے الفاظ میں، حبطت أعمالهم فی الدنیا والآخرة کا مصداق قرار پائیں گے۔

اِس دنیا میں کوئی بھی عمل صرف انسان کی کوشش سے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اِس دنیا میں کسی عمل کی کامیابی کی لازمی شرط یہ ہے کہ اس کو خدا کی تائید حاصل ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کی عقل کا امتحان ہورہا ہے۔ خدا کی طرف سے جب بھی کوئی امکان کھولا جاتا ہے تو وہ ہمیشہ ایک خاموش امکان کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ کبھی آسمان سے آواز نہیں آتی، حتی کہ جب اِس دنیا میں خدا کا کوئی پیغمبر آتا ہے تو بلاشبہہ وہ خدا کا ایک خصوصی منصوبہ ہوتا ہے، لیکن اُس وقت بھی آسمان سے یہ آواز نہیں آتی کہ — اے لوگو، یہ خدا کا رسول ہے۔ اس کو سنو اور اس کا اتباع کرو۔ یہ ایک دریافت کا معاملہ ہے جو انسان کو اپنی عقل کے استعمال کے ذریعے خود کرنا پڑتا ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ اِس معاملے میں

مکمل طور پر ناکام رہے۔ موجودہ زمانے میں خدا نے انتہائی اعلیٰ قسم کے دینی مواقع کھول دئے ہیں، لیکن مسلم رہنما، خواہ وہ عرب رہنما ہوں یا غیر عرب رہنما، سب کے سب اِس معاملے میں بے خبر رہے۔ وہ خدا کی اسکیم کے خلاف کسی اور میدان میں زور آزمائی کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 200 سال سے بھی زیادہ مدت تک جان و مال کی قربانیاں دینے کے باوجود اُنھیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

خدا کا مقصود کیا ہے

خدا کے نزدیک کرنے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انسان کو خدا کے منصوبۂ تخلیق سے باخبر کیا جائے۔ اِسی مقصد کے لیے خدا نے اپنے تمام رسول بھیجے، اور اِسی مقصد کے لیے آخر میں قرآن بھیجا اور اس کے متن (text) کو مکمل طور پر محفوظ کر دیا۔ قرآن اِس تخلیقی منصوبے کا ایک مستند بیان (authentic statement) ہے۔ اب ضرورت ہے کہ یہ خدائی بیان ہر دور کے انسانوں تک پہنچتا رہے۔ اِسی عمل کا نام دعوت الی اللہ ہے۔

مقامی دعوت سے عالمی دعوت تک

پچھلے زمانوں میں جن داعیوں نے دعوت الی اللہ کا کام کیا، ان کا کام مقامی دائرے تک محدود رہا۔ دعوت کا کام ہمیشہ وسائل کی مدد سے ہوتا ہے اور پچھلے زمانے میں عالمی وسائل نہ ہونے کی بنا پر زیادہ وسیع دائرہ میں کام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انسانی آبادی پورے کرہ ارض پر پھیلی ہوئی تھی، لیکن پچھلے زمانے کے داعیوں کا دعوتی کام وسائل کے فقدان کی وجہ سے عملاً مقامی دائرے تک محدود رہا۔

تائید کا انتظام

اللہ تعالیٰ نے عالمِ فطرت (nature) کے اندر بالقوہ (potential) طور پر ایسے امکانات رکھے تھے جن کو دریافت کر کے اہلِ ایمان عالمی دائرے میں اپنے دعوتی عمل کو انجام دے سکیں۔ یہ امکان بنیادی طور پر وہ تھا جس کو کمیونکیشن (communication) کہا جاتا ہے۔ وہ تمام چیزیں جن کو موجودہ زمانے میں ماڈرن کمیونکیشن (modern communication) کہا جاتا ہے، وہ فطرت کے امکانات کو دریافت کر کے ہی وجود میں آئے ہیں — پرنٹنگ پریس، تیز رفتار سواریاں اور

ملٹی میڈیا، سب کا سب، عالم فطرت کے امکانات کو دریافت کرکے تیار کیا گیا ہے۔ یہ تمام مواصلاتی ذرائع اِسی لیے وجود میں آئے ہیں کہ اہلِ ایمان اُن کو بھرپور طور پر استعمال کریں اور اللہ کے پیغام کو پرامن طور پر تمام انسانوں تک پہنچادیں۔

موجودہ مسلمانوں کی ناکامی

اسلام کے ظہور کے بعد اللہ تعالی نے مسلمانوں کو سیاسی اقتدار عطا کیا۔ یہ سیاسی اقتدار ساتویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارھویں صدی تک کسی نہ کسی طور پر جاری رہا۔ اِس اقتدار کا مقصد حکومت یا عیش وعشرت نہیں تھا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمان بے خوف ہوکر فطرت (nature) کی تحقیق کریں اور فطرت میں چھپے ہوئے امکانات کو دریافت کرکے وہ مواصلاتی وسائل تیار کریں جن کے ذریعے سے دعوت الی اللہ کے کام کو عالمی طور پر انجام دیا جاسکے۔

اِس معاملے میں اللہ تعالی نے ایسے اشارے کردئے تھے جو مسلمانوں کے لیے اپنے رول کو سمجھنے کے لیے کافی ہوسکتے تھے، مگر مسلمان اشارے کی زبان کو سمجھ نہ سکے۔ مثلاً قرآن میں کثرت سے ایسی آیتیں ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ زمین اور آسمان کی تمام چیزیں تمھارے لیے مسخر کردی گئی ہیں۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ کائنات کی تخلیق اِس طرح ہوئی ہے کہ انسان اُس میں غور وفکر کرکے اس کے اندر چھپے ہوئے موافق امکانات کو دریافت کرے اور اُن کو اپنے حق میں استعمال کرے۔ وہ چیز جس کو آج مواصلاتی ٹکنالوجی کہا جاتا ہے، وہ سب اِس کے اندر شامل ہے۔

دوسرا اہم اشارہ وہ ہے جو اسراء کے واقعے کی صورت میں پیش آیا۔ مکی دور کے آخر میں یہ واقعہ ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی انتظام کے تحت ایک رات کے اندر مسجد حرام (مکہ) سے مسجد اقصی (یروشلم) لے جایا گیا اور پھر واپس اپنے مقام پر پہنچادیا گیا۔ اِس واقعے کا ذکر قرآن کی سورہ الاسراء (17) میں کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ مکہ اور یروشلم کے درمیان تقریباً 1250 کلومیٹر کا فاصلہ ہے، یعنی رٹرن جرنی (return journey) کے اعتبار سے 2500 کلومیٹر کا فاصلہ۔

قرآن کی جس سورہ میں اِس واقعے کا ذکر ہے، اس میں مقصدِ سفر کو اِن الفاظ میں

بیان کیا گیا ہے: لنریہ من آیاتنا (17:1) یعنی تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں:

So that We might show him some of Our signs.

اِس آیت میں جس نشانی کا ذکر ہے، اس سے مراد خود سفر ہے، نہ کہ یروشلم میں واقع کوئی چیز۔ اللہ تعالی نے اپنے آخری پیغمبر کے ذریعے جو کتاب ہدایت (قرآن) بھیجی، وہ اِس لیے تھی تاکہ وہ کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچے۔ یہ عالمی پیغام رسانی کیوں کر ممکن ہوگی، اس کے بارے میں اشاراتی طور پر بتایا گیا کہ عالمِ فطرت (nature) میں اللہ نے بالقوہ طور پر تیز رفتار ترسیل (rapid communication) کے امکانات رکھ دئے ہیں جن کو دریافت کرکے واقعہ بناؤ اور اُن کو تمام اہلِ عالم تک پیغام خداوندی (قرآن) کو پہنچانے کے لیے استعمال کرو۔

استبدالِ قوم کا اصول

امتِ مسلمہ کو اللہ تعالی نے لمبی مدت تک یہ موقع دیا کہ وہ فطرت کے اِس امکان کو واقعہ بنائے اور قرآن کے سلسلے میں اپنی عالمی ذمے داری کو پورا کرے، لیکن امتِ مسلمہ کے رہنما اور قائدین اِس راز کو نہ سمجھ سکے۔ وہ دوسرے میدانوں میں سرگرم رہے، لیکن دعوت الی اللہ کے عالمی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو عمل مطلوب تھا، اُس عمل کو انجام دینے میں وہ پوری طرح ناکام رہے۔

اِس کے بعد اللہ تعالی کی وہ سنت ظاہر ہوئی جس کو قرآن میں استبدالِ قوم (47:38) کہا گیا ہے، یعنی ایک خدائی مطلوب کو انجام دینے میں اگر ایک گروہ ناکام ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرے گروہ کو لے آنا — موجودہ زمانے میں جن مغربی قوموں نے دورِ مواصلات (age of communication) پیدا کیا ہے، وہ اِسی استبدالِ قوم کی توسیعی صورت ہے۔

تائید بذریعہ سیکولر اقوام

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی پیشین گوئیاں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ اُن میں سے ایک پیشین گوئی کے الفاظ یہ ہیں: إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3062) یعنی اللہ یقیناً اِس دین کی تائید فاجر انسان کے ذریعے کرے گا۔

اِس حدیث میں 'فاجر' سے مراد سیکولر ہے۔ اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب امتِ مسلمہ دعوتِ دین کے عالمی ذرائع کو دریافت کرنے میں ناکام ہوجائے گی تو اُس وقت اللہ تعالیٰ سیکولر لوگوں کو کھڑا کرے گا جو اِس کام کو انجام دیں، یعنی جب دینی محرک (religious incentive) اِس کام کو انجام دینے میں ناکام ہوجائے گا تو اللہ کچھ لوگوں کو دنیوی محرک (secular incentive) کے ذریعہ اٹھائے گا۔ وہ فطرت میں تحقیق وجستجو کے ذریعے فطرت میں چھپے ہوئے امکانات کو واقعہ بنائیں گے۔ یہ اُن لوگوں کی طرف سے امتِ مسلمہ کے لیے ایک سپورٹنگ رول ہوگا۔

موجودہ زمانے میں، خاص طور پر انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں، اہلِ مغرب نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں جو دریافتیں کی ہیں، وہ سب اِسی نوعیت کی ہیں۔ اِن دریافتوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے دعوتی مشن کو انجام دینے کے لیے ایک خارجی سپورٹ کا انتظام کیا ہے۔

ملی رہنماؤں کی ناکامی

اہلِ مغرب نے تائید کا جو کام انجام دیا، اُس کے پیچھے کوئی دینی جذبہ نہیں تھا۔ یہ کام انھوں نے اپنے مادی اور قومی جذبے کے تحت کیا۔ یہ بالکل فطری تھا۔ اِس قسم کے ذاتی محرک کے بغیر وہ خارجی سپورٹ فراہم کرنے کا کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔ مزید یہ کہ جب انھوں نے اتنا بڑا تاریخی کام انجام دیا تو یہ بھی فطری تھا کہ اُن کو عالمی دبدبہ حاصل ہوجائے۔ کسی بڑے رول کے ساتھ دبدبہ اِس طرح جڑا ہوا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اِس کے ذریعے اُن کو نہ صرف مادی فائدے حاصل ہوئے، بلکہ اُن کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر سیاسی غلبہ بھی حاصل ہوگیا۔ یہ اُن کے سپورٹنگ رول کی قیمت تھی۔ اِس قیمت کے بغیر وہ اپنا سپورٹنگ رول انجام نہیں دے سکتے تھے۔

موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اِس راز کو نہیں سمجھا۔ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کرنے میں عاجز رہے۔ وہ اِس حکمت (wisdom) کا ثبوت نہ دے سکے جس کو اِن الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ — متعلق حصے کو لینا اور غیر تعلق حصے کو چھوڑ دینا۔

مغربی قومیں جب جدید طاقتوں کے ساتھ ایشیا اور افریقہ میں داخل ہوئیں تو اِس داخلے کے

دو پہلو تھے— ایک، یہ کہ اِن مغربی قوموں نے فطری طور پر اُس وقت کی مسلم دنیا میں سیاسی غلبہ حاصل کرلیا۔ اِس واقعے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ یہ قومیں اُس عظیم نعمت کو لے کر آئی تھیں جو خود اسلام کا عین مطلوب تھا، جس کا ہزار سال سے تاریخ کو انتظار تھا، یعنی جدید مواصلات (modern communication)۔ مگر موجودہ زمانے کے مسلم رہنما بروقت اُس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے جو اُس وقت اُن سے مطلوب تھی، یعنی سیاسی مسئلے کو عملی طور پر نظر انداز کرنا اور کمیونکیشن کے جدید ذرائع کو بھرپور طور پر دعوت کے لیے استعمال کرنا۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے تمام مسائل اِسی دانش مندی کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔

ایک عرب شیخ عبدالرحمن الحسبنکہ نے اپنی ایک کتاب میں بتایا ہے کہ اِس وقت امتِ مسلمہ کے تمام مسائل کا اصل سبب تین اژدہے ہیں۔ مصنف کے نزدیک، یہ تین اژدہے یا یہ تین بڑے سانپ یہ ہیں— استعمار (colonialism)، استشراق (orientalism)، مسیحی مبلغین (Christian missionaries)۔ یہ کسی ایک مصنف کی بات نہیں، یہی موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلم رہنماؤں کی سوچ ہے۔ اسی غلط سوچ کا یہ نتیجہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان پچھلے 200 سال کے اِن مفروضہ ''افاعی'' سے لڑنے اور ان کو ختم کرنے میں مشغول ہیں، لیکن عملی نتیجہ مکمل طور پر برعکس صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں ''افاعی'' اپنی حقیقت کے اعتبار سے افاعی نہ تھے، بلکہ مذکورہ حدیثِ رسول کے مطابق، وہ مویدینِ اسلام (supporters of Islam) کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں سے موجودہ زمانے میں وہ چیز وجود میں آئی جس کو جدید مواصلات کہا جاتا ہے۔ جدید مواصلات کو انھوں نے اپنے مقصد کے لیے ڈیولپ کیا تھا، لیکن جدید مواصلات، عالمی مواصلات ہیں، اُن پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ اگر مسلم علما اور رہنما صرف یہ کرتے کہ وہ اِن مفروضہ افاعی کے خلاف ٹکراؤ کا محاذ نہ کھولتے اور پُرامن طریق کار اختیار کرتے تو بلاشبہہ وہ جدید مواصلات کو کامل طور پر اپنے حق میں استعمال کرسکتے تھے اور اسلام کی عالمی دعوت کے اُس منصوبے کو پورا کرسکتے تھے،

جس کا تاریخ کو ہزار سال سے انتظار ہے۔

ایک تاریخی حوالہ

پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ (Thomas Walker Arnold) ایک ممتاز برٹش مستشرق (orientalist) تھے۔ وہ 1864 میں لندن میں پیدا ہوئے اور 1930 میں اُن کی وفات ہوئی۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر اسلامی دعوت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب 508 صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ پہلی بار 1896 میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Preaching of Islam

اِس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے لے کر بعد کے ہزار سال تک مختلف ملکوں میں اسلام کی دعوت کس طرح پھیلی۔ مثال کے طور پر افریقہ کے بارے میں انھوں نے ایک رپورٹ کے حوالے سے اپنی اِس کتاب میں لکھا ہے کہ — اِس وقت جس رفتار سے افریقہ میں اسلام پھیل رہا ہے، اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نائجر دریا کے دونوں کناروں پر 1910 تک مشکل ہی سے کوئی گاؤں بچے گا جو اسلام کے حلقے میں نہ آ گیا ہو:

> A Christian missionary reports: "When I came out in 1898, there were few Muhammadans to be seen below Iddah. Now they are everywhere, excepting below Abo, and at the present rate of progress there will scarcely be a heathen village on the river (Niger) banks by 1910." (p. 329)

پروفیسر آرنلڈ نے یہ بات مغربی افریقہ کے نائجر دریا کے دونوں طرف واقع بستیوں کے بارے میں لکھی ہے۔ واضح ہو کہ نائجر دریا تقریباً چار ہزار دو سو کلومیٹر (4, 180) لمبا ہے۔ وہ افریقہ کے پانچ ملکوں کے درمیان بہتا ہے، یعنی — گائنا (Guinea)، مالی (Mali)، نائجر (Niger) بینن (Benin)، نائجیریا (Nigeria)۔ اِسی مثال پر دوسرے ملکوں کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کی دعوتی توسیع کا یہ عمل انیسویں صدی میں عین اُس وقت رک گیا، جب کہ پرنٹنگ پریس

اور جدید مواصلات کی آمد نے اسلامی دعوت کی عالمی توسیع کا امکان بڑے پیمانے پر کھول دیا تھا— اِس کا سبب یہ تھا کہ انیسویں صدی میں جب یہ نئے امکانات کھلے تو عین اُسی زمانے میں ایک ''مسئلہ'' بھی پیدا ہوگیا، وہ یہ کہ مغربی تہذیب اور مغربی استعمار (Western Colonialism) نے نئے طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے مسلم ملکوں میں اپنا دبدبہ قائم کرلیا۔

اُس وقت یہ ہوا کہ تمام دنیا کے مسلمان منفی ردعمل (negative reaction) میں مبتلا ہوگئے۔ انھوں نے مغربی تہذیب اور مغربی استعمار کے خلاف لڑائی کا محاذ کھول دیا۔ کچھ لوگ تقریر اور تحریر کے ذریعے اِس قومی مہم میں شریک ہوگئے، اور کچھ لوگوں نے بطور خود اس کو جہاد قرار دے کر اس کے خلاف مسلح جنگ چھیڑ دی۔

یہ صورتِ حال عملاً آج بھی باقی ہے۔ دعوت کے مواقع برباد ہو رہے ہیں اور مسلمان انتہائی ناکام طور پر قومی اور سیاسی لڑائی میں مشغول ہیں۔ اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے جب کہ ساری دنیا کے مسلمان ان تباہ کن سرگرمیوں کو مکمل طور پر ختم کردیں اور پوری یکسوئی کے ساتھ دعوت الی اللہ کے کام میں مشغول ہوجائیں۔ (2012)

ہندی داں طبقے کے لئے ایک قیمتی تحفہ

''پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کا جیون''

''سیرتِ رسول'' کا ہندی ترجمہ

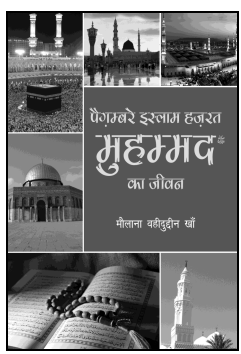

یہ کتاب سیرتِ رسول کا ایک سادہ اور واقعاتی مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو تاریخ وار انداز میں، کسی تشریح یا تعبیر کے بغیر، بیان کیا گیا ہے۔ وہ پیغمبر اسلام کی زندگی کی ایک تاریخی تصویر ہے۔ زیرِ نظر کتاب معلوماتی اسلوب میں سیرتِ رسول کا ایک تفصیلی تعارف ہے۔

اسلام کا انقلابی رول

مورخ ابنِ کثیر نے اپنی مشہور کتاب البدایۃ والنہایۃ میں ابنِ اسحاق کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے۔ اِس روایت میں ایک واقعے کا ذکر ہے جو نبوت کے دسویں سال مکہ میں پیش آیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اپنی آخر عمر میں جب بیمار ہوئے اور اُن کا مرض بڑھ گیا تو قبیلہ قریش کے لوگوں نے آپس میں کہا کہ حمزہ اور عمر نے اسلام قبول کرلیا اور محمد کا امر (دین) پورے قبیلہ قریش میں پھیل گیا۔ آؤ ہم ابوطالب کے پاس چلیں۔ وہ ہم سے عہد لے لیں اپنے بھتیجے کے بارے میں اور بھتیجے سے عہد لے لیں ہمارے بارے میں۔ کیوں کہ خدا کی قسم، ہم اِس سے مامون نہیں ہیں کہ وہ ہمارے امر (دین) پر غالب آجائے۔ چناں چہ قریش کے سردار ابوطالب کے پاس آئے اور اُن سے بات کی۔ یہ تھے — عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، امیہ بن خلف، ابوسفیان بن حرب، وغیرہ۔ انھوں نے کہا کہ اے ابوطالب، آپ کا ہمارے نزدیک جو درجہ ہے، وہ آپ کو معلوم ہے۔ آپ پر جو وقت آچکا ہے، وہ آپ خود دیکھ رہے ہیں۔ آپ کے بارے میں ہمیں تشویش ہے۔ ہمارے اور آپ کے بھتیجے کے درمیان جو معاملہ ہے، اُس سے آپ باخبر ہیں۔ آپ ان کو بلائیے۔ اُن سے ہمارے بارے میں عہد لے لیجئے اور ہم سے ان کے بارے میں عہد لے لیجئے، تاکہ وہ ہم سے باز رہیں اور ہم اُن سے باز رہیں، تاکہ وہ ہمارے دین سے تعرض نہ کریں اور ہم ان کے دین سے تعرض نہ کریں۔ پھر ابوطالب نے رسول اللہ کو بلایا اور آپ ان کے پاس آئے۔ ابوطالب نے آپ سے کہا کہ اے میرے بھتیجے، یہ تمھاری قوم کے بڑے لوگ ہیں۔ یہ تمھارے پاس جمع ہوئے ہیں، تاکہ تمھارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہوجائے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''یاعمّ، کلمة واحدة تعطونها تملکون بها العرب وتدین لکم بها العجم (البدایۃ والنہایۃ 3/123) یعنی اے میرے چچا، میں اُن سے صرف ایک کلمہ چاہتا ہوں جس کو اگر وہ دے دیں تو وہ عرب کے مالک بن جائیں گے اور عجم تمھارے تابع ہوجائیں گے۔

اس کے بعد آپ نے بتایا کہ وہ کلمہ یہ ہے کہ تم کہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور تم چھوڑ دو اُن چیزوں کو جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو (تقولون لا إله إلا الله وتخلعون ما تعبدون من دونه) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس قول میں ایک تاریخی بات کو مخاطبین کی مانوس زبان میں کہا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مشن کوئی محدود مشن نہیں ہے۔ یہ خالق کی ایک عظیم منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک دور کو ختم کرکے دوسرے دور کو لانے کا منصوبہ ہے۔ اگر تم اُس کا ساتھ دو تو یہ تمھارے لیے سرفرازی کا باعث ہوگا۔ اِس مشن کا ساتھ دے کر تم ایک نئے دورِ تاریخ کے نقیب (harbinger) بن سکتے ہو۔

توحید کے مشن کے ذریعے بعد کی تاریخ میں یہ انقلابی دور آیا۔ اُس نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلم علما اور مورخین نے اِس واقعے کو صرف امتِ مسلمہ کے ایک سیاسی فخر (political glory) کے طور پر لیا۔ وہ اِس انقلاب کے وسیع تر پہلوؤں کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ لیکن سیکولر مورخین نے اِس پہلو کو دریافت کیا اور کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا۔ انھیں میں سے ایک فرانس کا مورخ ہنری پرین (وفات: 1935) ہے۔ ہنری پرین نے اِس حقیقت کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے — اسلام نے زمین کے نقشے کو بدل دیا۔ تاریخ کا روایتی ڈھانچہ توڑ دیا گیا:

Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was overthrown.

اِس تاریخی واقعے کی اصل اہمیت اِس اعتبار سے نہیں تھی کہ اس کے نتیجے میں ایک مسلم ایمپائر وجود میں آئے۔ اِس واقعے کی اصل اہمیت یہ تھی کہ اُس نے انسانی تاریخ کے سفر کو صحیح رخ کی طرف موڑ دیا، اس نے انسانی تاریخ کو خدائی منصوبے کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔

اللہ تعالی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو زمین پر بسایا اور اس کو ہر طرح کی آزادی دی۔ اِس تخلیق کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انسان موجودہ دنیا میں آئڈیل حکومت بنائے یا آئڈیل سماج قائم کرے۔ انسان کی آزادی کی بنا پر دنیا میں وہی ہونا تھا جس کو فرشتوں نے فساد (2:30) سے

تعبیر کیا تھا۔تخلیق کے اعتبار سے، فساد کا لفظ کوئی منفی لفظ نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں مختلف قسم کے ناموافق حالات پیدا ہوں، تاکہ انسان کے لیے مسلسل طور پر چیلنج کی صورت حال باقی رہے۔چیلنج کی یہ صورتِ حال عین مقصودِ تخلیق ہے، کیوں کہ اِسی صورتِ حال کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ افراد کے لیے امتحان کا ماحول جاری رہے اور مطلوب افراد کا انتخاب ممکن ہو سکے۔

قرآن کی سورہ الانعام میں انسان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی (6:94)۔قرآن کے اِن الفاظ کا لفظی ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی نے اِس طرح کیا ہے—اور آئے تم ہمارے پاس ایک ایک۔شاہ عبدالقادر دہلوی کا یہ ترجمہ قرآن کی مذکورہ آیت کا نہایت صحیح ترجمہ ہے۔ 'فرادی' کا لفظ 'فرد' کی جمع ہے، یعنی افراد۔قرآن کی یہ آیت خدا کے تخلیقی منصوبے کے ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔اللہ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو زمین پر بسایا۔اِس آبادکاری کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انسان دنیا میں بہتر سماجی نظام بنائے۔بہتر سماجی نظام کی جگہ صرف جنت ہے۔

خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، موجودہ دنیا اقامتِ نظام کے لیے نہیں ہے، بلکہ انتخابِ افراد کے لیے ہے۔حقیقت یہ ہے کہ انسان کی آزادی کی بنا پر اِس دنیا میں کسی معیاری نظام کا بننا ممکن ہی نہیں۔پوری تاریخ میں تقریباً تمام ذہن مسلم اور غیر مسلم دونوں، ایک ہی مشترک غلطی میں مبتلا رہے ہیں۔انھوں نے بہتر سماجی نظام قائم کرنے کو اپنی جدوجہد کا نشانہ بنایا۔مگر بلا استثنا سب کے سب اِس مقصد میں ناکام رہے۔اس کا سبب یہ تھا کہ اِس قسم کا نشانہ عملی طور پر ممکن ہی نہ تھا، کیوں کہ وہ منصوبہ خداوندی کے خلاف تھا۔

خالق نے اپنے منصوبے کے مطابق، دنیا کو اِس طرح بنایا ہے کہ وہ ہمیشہ 'دار الکبد' بنی رہے۔اِس طرح یہ ممکن ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر قسم کے حالات پیدا ہوں۔لوگوں کو بار بار نقصان (2:155) کا تجربہ ہو۔طرح طرح کے حادثات پیش آئیں۔انسان اور شیطان کی طرف سے آزادی کے غلط استعمال کی بنا پر لوگوں کے درمیان کشمکش جاری رہے۔یہ ناموافق حالات عین مطلوب ہیں۔ کیوں کہ اِسی صورتِ حال کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہر انسان کے بارے میں یہ دیکھا جائے کہ

مختلف حالات کے درمیان اس نے کیسا رسپانس دیا۔ اُس نے حالات کو اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے استعمال کیا یا منفی ردعمل میں اپنا وقت ضائع کر دیا۔

امتحانی صورتِ حال کے اِس نتیجے کا تعلق افراد سے ہے۔ ہر فرد الگ الگ حالتِ امتحان میں ہے۔ ہر فرد الگ الگ اپنا ریکارڈ تیار کر رہا ہے۔ ہر فرد الگ الگ یہ بتا رہا ہے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہے یا نہیں۔

اسلامی انقلاب کا مقصد

رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے جو انقلاب آیا اور آخر کار اس کے نتیجے میں دنیا کا نقشہ بدل گیا، وہ اِسی لیے تھا کہ مذکورہ قسم کی حالت دنیا میں غیر منقطع طور پر جاری رہے۔ اسلامی انقلاب کا مقصد نہ کوئی ایمپائر قائم کرنا تھا اور نہ کوئی بہتر سیاسی یا سماجی نظام۔ اِس انقلاب کا واحد مقصد یہ تھا کہ فرد کے لیے اپنی شخصیت کی تعمیر کے مواقع لامحدود طور پر کھل جائیں۔ جو فرد یہ چاہے کہ اس کو حقیقتِ اعلیٰ کو دریافت کرنا ہے، اُس کو اپنی شخصیت کو جنتی شخصیت کے طور پر ڈیولپ کرنا ہے، اِسی کے ساتھ اُس کو دعوت الی الخیر (3:104) کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن بنانا ہے، جو فرد یا افراد ایسا چاہیں، اُن کے لیے ہر قسم کے مواقع پوری طرح کھلے رہیں۔

اسلامی انقلاب کا مقصد اصلاً یہی تھا۔ اسلامی انقلاب کا مقصد یہ تھا کہ زمین پر عالمی مواقع کی ایک دنیا (world of universal opportunities) وجود میں آئے۔ اِس قسم کی ایک دنیا صرف لمبے عمل کے ذریعے بن سکتی تھی۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد تاریخ میں جو پراسس جاری ہوا تھا، وہ تقریباً ہزار سال تک اپنا کام کرتا رہا، یہاں تک کہ بیسویں صدی میں وہ اپنی آخری تکمیل تک پہنچ گیا۔

عجیب بات ہے کہ اسلامی انقلاب کی اِس نوعیت کو نہ مسلم مفکرین نے سمجھا اور نہ غیر مسلم مفکرین نے۔ دونوں کے لیے اس کا مشترک سبب یہ تھا کہ وہ تاریخ کا مطالعہ اللہ کے تخلیقی منصوبے کی روشنی میں نہ کر سکے۔ وہ خود اپنے خود ساختہ ذہن کے تحت تاریخ کا مطالعہ کرتے رہے۔ اِس بنا پر دونوں گروہوں کا حال

یہ ہوا کہ وہ اُس خدائی حکمت (divine wisdom) سے بے خبر رہے جو انسانی تاریخ کے درمیان مسلسل طور پر اور موثر طور پر جاری رہی۔

دورِ آزادی

اسلام کا ظہور تاریخ میں ایک انقلاب کا ظہور تھا۔ رسول اور اصحابِ رسول کی کوششوں کے ذریعے تاریخ انسانی میں پہلی بار آزادی کا دور آیا۔ اِس سے پہلے ہزاروں سال سے دنیا میں شخصی سلطنت کا مستبدانہ نظام (despotism) قائم تھا۔ اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی تھیں کہ بظاہر اُن کو ختم کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ رسول اور اصحاب رسول کی قربانیوں سے تاریخ میں ایک ایسا طاقت ور پراسس جاری ہوا جس نے شخصی مطلق العنانی کے نظامِ حکومت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ قرآن میں اِس انقلابی واقعے کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (24:55) یعنی ایسا لازماً ہونا ہے کہ دنیا سے دورِ خوف کا خاتمہ ہو اور دورِ امن ابدی طور پر دنیا میں آجائے۔

حضرت عمر فاروق نے ایک عظیم سلطنت کے حکمراں کی حیثیت سے اپنے عہد خلافت میں اِسی حقیقت کا اظہار کیا تھا، جب کہ انھوں نے ایک واقعے کے بعد مصر کے مسلم گورنر کو خطاب کرتے ہوئے کہا: يا عمرو، متى استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا (سيرة عمر بن الخطاب، علي محمد الصلابّي: 1/306) یعنی اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، جب کہ ان کی ماؤں نے اُن کو آزاد پیدا کیا تھا۔

یہ انقلابی عمل تاریخ میں جاری رہا، یہاں تک کہ وہ سفر کرتے ہوئے یورپ تک پہنچ گیا۔ گیارہ سو سال کے بعد فرانس کے جمہوری مفکر روسو (Rousseau) نے اپنی کتاب 'سوشل کنٹریکٹ' میں لکھا کہ — انسان آزاد پیدا ہوا تھا، لیکن میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chains.

اِسی انقلابی عمل (revolutionary process) کے بعد کے مرحلے میں 1789 میں فرانسیسی انقلاب (French Revolution) کا واقعہ ہوا۔ اِس انقلابی عمل کی تکمیل 1948 میں ہوئی

جب کہ دنیا کی تمام قوموں کے اتفاق سے اقوامِ متحدہ (UNO) کی عالمی تنظیم وجود میں آئی۔

انسانی تاریخ میں آزادی کے دور کا آنا کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ گویا کہ تاریخ میں ایک شاہ ضرب (master stroke) کا معاملہ تھا جس کے نتیجے میں اُن تمام امکانیات کی انفولڈنگ (unfolding) شروع ہوگئی جس کو خالق نے انسان کے لیے مقدر کیا تھا۔

اِس دورِ آزادی کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ اللہ کے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسانی زندگی میں آزادی کا وہ دور شروع ہوا جب کہ کھلے ماحول میں ہر عورت اور مرد کا امتحان (test) ممکن ہو سکے۔ اِسی کے نتیجے میں دنیا کی سیاست میں سیکولرازم اور جمہوریت کا زمانہ آیا جس نے تاریخ میں پہلی بار مذہبی جبر کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ اِسی کے بعد یہ ممکن ہوا کہ انسان ہر قسم کے توہمات (superstitions) سے آزاد ہو کر فطرت کا مطالعہ کرے۔ اِسی مطالعے کا نتیجہ سائنسی علوم کا ظہور تھا جس نے پہلی بار انسان کے لیے اعلیٰ معرفت (higher realization) کا دروازہ کھول دیا۔ اِسی کے نتیجے میں پرنٹنگ پریس اور جدید مواصلات کی دریافت ہوئی جس نے تاریخ میں پہلی بار عالمی دعوت کو ممکن بنا دیا، وغیرہ۔

موجودہ زمانے میں آزادی کو خیرِ اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ لیکن موجودہ دنیا میں آزادی کے ساتھ آزادی کے غلط استعمال (misuse of freedom) کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اِس بنا پر آزادی کی قدر و قیمت کو صرف اُس وقت سمجھا جا سکتا ہے، جب کہ لوگوں کی طرف سے آزادی کے غلط استعمال کے پہلو کو الگ کر کے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ (2013)

ادارہ 'المورد' (لاہور، پاکستان) کی اردو اور انگریزی مطبوعات (میزان، البیان، وغیرہ) گڈ ورڈ بکس میں دستیاب ہیں۔ ان کو یہاں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

صدر اسلامی مرکز کے ویڈیو لکچرز حسب ذیل ویب سائٹ پر بھی دیکھے جا سکتے ہیں:

http//:www.meezan.tv

اسلام اور جنگ

ایک حدیثِ رسول میں، قرآن کی بابت بتایا گیا ہے کہ: لكلّ آية منها ظَهر وبطن (صحيح ابن حبان، رقم الحديث: 75) یعنی قرآن کی ہر آیت کا ایک مفہوم وہ ہے جو سطور (lines) میں ہے اور دوسرا وہ ہے جو اس کے بین السطور میں پایا جاتا ہے۔ یہ حدیث اگرچہ قرآن کے بارے میں ہے، لیکن توسیعی مفہوم کے اعتبار سے حدیثِ رسول بھی اس میں شامل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور حدیث کے متن میں تفسیری اور تشریحی اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ اِس اضافے کے بغیر، قرآن وحدیث کی معنویت واضح نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر قرآن کی ایک آیت یہ ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30:41)۔ قرآن کی اِس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے: ''خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا، لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی کے سبب سے''۔ مگر اِس لفظی ترجمے سے آیت کا اصل مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ آیت کے اصل مفہوم کو جاننے کے لیے اس میں یہ تشریحی اضافہ کرنا پڑے گا کہ — خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا، اس لیے کہ لوگوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا۔

اِسی طرح ایک حدیثِ رسول اِن الفاظ میں آئی ہے: مَن قال لا إله إلا الله، دخل الجنة۔ اس حدیث کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ جس شخص نے کہا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ جنت میں داخل ہوگا۔ حدیث کا یہ ترجمہ حدیث کے اصل مفہوم کو واضح نہیں کرتا۔ حدیث کے اصل مفہوم کو واضح کرنے کے لیے اس میں یہ اضافہ کرنا پڑے گا کہ — جس شخص نے اِس حقیقت کا اقرار کیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے مطابق اس نے عمل کیا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔

جنگ کا مسئلہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو آگاہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: إذا وضع السيفُ في أمتي، لم يرفع عنهم إلى يوم القيامة (مسند احمد، جلد 5، صفحہ 278)۔ اِس حدیث کا

لفظی ترجمہ یہ ہے — جب میری امت کے اندر تلوار داخل ہوجائے تو قیامت تک وہ اُس سے اٹھائی نہیں جائے گی۔ مذکورہ حدیثِ رسول کا یہ ترجمہ لفظی طور پر ایک صحیح ترجمہ ہے۔ لیکن صرف یہ ترجمہ، حدیث کی اصل معنویت کو ظاہر نہیں کرتا۔

بظاہر اس حدیث میں امت کے اندر تلوار کے اُس داخلے کا ذکر ہے جو عہد رسالت کے بعد پیش آئے گا۔ لیکن تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو امت کے اندر تلوار کا داخلہ خود زمانہ رسول میں پیش آچکا تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، غزوۂ بدر، غزوۂ حنین، غزوۂ خیبر کے مواقع پر امتِ محمدی نے تلوار اٹھائی، جب کہ اِن چاروں مواقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم باحیات تھے۔ اس کے علاوہ، قرآن کی متعدد آیتوں میں خود زمانہ رسول میں قتال کا ذکر ہے۔ بظاہر یہ ایک تضاد کی صورت حال ہے۔ اِس لیے ہمیں کوئی ایسا اصول دریافت کرنا پڑے گا جو اِس ظاہری تضاد کو رفع کرنے والا ہو۔

جنگ کی دو قسمیں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو جنگ پیش آئی، اس کی نوعیت کیا تھی، وہ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتی ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (8:39) یعنی تم اُن سے قتال کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب، اللہ کے لیے ہوجائے۔

اِس آیت میں 'فتنہ' سے مراد مذہبی جبر (religious persecution) ہے۔ قدیم زمانے میں اُس وقت کے سیاسی فلسفہ (political philosophy) کی بنا پر، ساری دنیا میں مذہبی جبر کا کلچر قائم تھا۔ اِس کلچر نے قدیم زمانے میں پُرامن دعوت (peaceful Dawah) کو عملاً ناممکن بنا دیا تھا۔ یہ تصور، خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف تھا، کیوں کہ خدا نے اپنے تخلیقی پلان کے تحت، ہر انسان کو فکر اور اظہارِ خیال کی کامل آزادی عطا کی ہے۔

مذہبی جبر پر مبنی مذکورہ سیاسی فلسفہ خدا کی دی ہوئی آزادی کو منسوخ کرنے کے ہم معنی تھا۔ خدا کو مطلوب تھا کہ مذہبی جبر کا یہ مصنوعی نظام ختم ہو اور مذہبی آزادی کا فطری نظام قائم ہوجائے۔ اِس

لیے اللہ تعالی نے رسول اور اصحابِ رسول کو یہ حکم دیا کہ ہر قیمت پر اِس مصنوعی نظام کو ختم کرو، خواہ اس کے لیے تم کو جنگ کرنا پڑے۔ رسول اور اصحابِ رسول نے اِس حکمِ خداوندی کی تعمیل کی، یہاں تک کہ اِس جبری نظام کا خاتمہ ہوگیا۔

اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے عبداللہ بن عمر کی ایک روایت کا مطالعہ مفید ہوگا۔ عبداللہ بن عمر (وفات: 73 ہجری) کے زمانے میں وہ جنگ پیش آئی جس کے قائد ایک طرف، عبداللہ بن زبیر تھے اور دوسری طرف، اموی حاکم حجاج بن یوسف الثقفی۔ یہ واقعہ تاریخ میں ''فتنۂ عبداللہ بن زبیر'' کے نام سے مشہور ہے۔

عبداللہ بن عمر اِس جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ دو مسلمان اُن کے پاس آئے اور اُن کو عار دلاتے ہوئے کہا کہ آپ اِس جنگ میں شریک نہیں ہیں، حالاں کہ اللہ تعالی نے قرآن میں حکم دیا ہے کہ: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ (8:29)۔ عبداللہ بن عمر نے کہا: قاتلنا حتى لم تكن فتنة، وكان الدين لله- وأنتم تريدون أن تقاتلوا حتى تكون فتنة، ويكون الدين لغير الله (صحيح البخاري، رقم الحديث: 4513) یعنی ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوگیا، اور دین اللہ کے لیے ہوگیا۔ اور تم چاہتے ہو کہ جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ دوبارہ واپس آجائے اور دین غیر اللہ کے لیے ہوجائے۔

عبداللہ بن عمر کے اِس قول کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیت میں 'فتنہ' سے مراد مذہبی جبر تھا۔ ہم نے لڑ کر اس مذہبی جبر کو ختم کر دیا۔ اب فطرت کے نظام کے مطابق، مذہب کے معاملے میں انسان کو آزادی حاصل ہوگئی، جب کہ تم لوگ اپنے سیاسی مفاد کے لیے جنگ کر رہے ہو اور اِس طرح دوبارہ ایک نئے قسم کا فتنہ برپا کر رہے ہو۔

ایک دور کا خاتمہ، دوسرے دور کا آغاز

اللہ نے انسان کو اِس دنیا میں امتحان (test) کے لیے رکھا ہے۔ امتحان کی اِس مصلحت کی بنا پر اللہ نے انسان کو کامل آزادی دی ہے۔ اس کو اِس دنیا میں فریڈم آف چوائس (freedom of choice)

حاصل ہے۔ یہ آزادی اگر باقی نہ رہے تو اللہ کا تخلیقی پلان درہم برہم ہوجائے گا۔ اِسی مصنوعی صورتِ حال کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے، اور فتنہ کی اِسی صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے رسول اور اصحابِ رسول کو جنگ کا حکم دیا گیا۔

اِس معاملے کی تفصیل یہ ہے کہ قدیم زمانے میں مذہب پر مبنی قومیت (nationality based on religion) کا اصول رائج تھا۔ اِس اصول کی بنا پر مذہب، اسٹیٹ کا معاملہ قرار پا گیا تھا۔ اسٹیٹ کا مذہب، اسٹیٹ سے وفاداری کی علامت بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے معاملے میں اسٹیٹ سے مختلف عقیدہ رکھنا، اسٹیٹ سے بغاوت کے ہم معنی بن گیا تھا۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جس نے قدیم زمانے میں مذہبی جبر (religious persecution) کا نظام قائم کر رکھا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جو انقلاب آیا، اُس نے اسٹیٹ کے تحت قائم شدہ مذہبی جبر کا خاتمہ کر دیا۔ مذہبی جبر کے خاتمے کے بعد تاریخ میں ایک نئے سیاسی نظریے کا آغاز ہوا۔ اِس کے بعد جو پراسس شروع ہوا، اس کی تکمیل انیسویں صدی میں یورپ میں ہوئی۔ اب مبنی بر مذہب قومیت آخری طور پر متروک قرار پائی۔ اِس کے بعد قومیت کا وہ نظام بنا جس کو وطن پر مبنی قومیت (nationality based on homeland) کہا جاتا ہے۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ انسان کے اندر اپنے وطن سے محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ یہ ایک عملی معاملہ ہے، نہ کہ کوئی اعتقادی معاملہ۔ قدیم زمانے میں مبنی بر مذہب قومیت نے اِس معاملے کو مذہبی عقیدے کا درجہ دے رکھا تھا۔ اِس لحاظ سے، مبنی بر مذہب قومیت کا نظریہ ایک فطری تصور تھا۔ ایسی حالت میں ضرورت تھی کہ اِس تعلق کو فطری بنیاد پر قائم کیا جائے۔ موجودہ زمانے میں مبنی بر وطن قومیت کے نظریے نے یہی کام انجام دیا ہے۔ اب تمام دنیا میں اِس اصول کو مان لیا گیا ہے کہ قومیت کا تعلق وطن سے ہے، نہ کہ مذہبی عقیدے سے۔ یہی نظام، فطرت کے مطابق ہے، اور اسلام دینِ فطرت ہونے کی حیثیت سے اِسی نظریے کی تائید کرتا ہے۔

قومیت ایک سیاسی نظریہ ہے، اور مذہب ایک غیر سیاسی عقیدہ۔ قدیم ریاستی نظریے کے تحت مذہبی جبر کا تصور پیدا ہوا۔ اِس تصور نے دینِ توحید اور اس کی دعوت کے لیے غیر ضروری مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ موجودہ زمانے میں وطن پر مبنی قومیت کے نظریے نے یہ ایک درست کام انجام دیا ہے کہ اس نے قومیت کی بنیاد مذہب کے بجائے وطن پر قائم کر دی ہے۔ یہ تبدیلی عین اسلام کے مطابق ہے۔ اس نے موجودہ زمانے میں پُرامن دعوتی عمل کے لیے لامحدود دروازے کھول دئے ہیں۔

قدیم زمانے میں اسلام اور اُس وقت کی حکومتوں کے درمیان جو جنگ پیش آئی، وہ ایک ناگزیر ضرورت کے تحت پیش آئی۔ کیوں کہ اہلِ اسلام جب توحید کی دعوت دیتے تھے تو اُس زمانے کے مبنی بر مذہب قومیت نظریے کی بنا پر اہلِ اقتدار یہ سمجھتے تھے کہ توحید کی دعوت، ریاست سے بغاوت کے ہم معنی ہے۔ اِس بنا پر وہ داعیانِ توحید کو اپنا حریف (rival) سمجھ لیتے تھے، جس کا نتیجہ جنگ ہوتا تھا۔ یہ جنگ قدیم نظام کی طرف سے جارحانہ طور پر ہوتی تھی اور اہلِ توحید کی طرف سے اس کی حیثیت ناگزیر دفاع کے ہم معنی تھی۔

موجودہ زمانے میں وطن پر مبنی سیاسی تصور نے مذہب اور سیاست کے درمیان ٹکراؤ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب مذہبی جبر (religious persecution) کا قدیم نظام باقی نہیں رہا اور داعیانِ توحید کو یہ موقع مل گیا کہ وہ ریاست سے ٹکراؤ کا خطرہ مول لئے بغیر اپنے پُرامن دعوتی عمل کو بلا رکاوٹ جاری رکھ سکیں۔ (2012)

سہارن پور (یوپی) میں مولانا وحید الدین خاں کی اردو، ہندی اور انگریزی کتابیں، قرآن مجید کے ترجمے، دعوتی لٹریچر اور ماہ نامہ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

Dr. M. Aslam Khan (Principal)
National Medical IGNOU Community College
38 Ayodhyapuram Mahipura Dehradun Road, Saharanpur, U.P.
www.nmicc.com, dr_aslm@rediff.com, +919997153735

قانونِ شریعت کا نفاذ

موجودہ زمانے میں مختلف مسلم ملکوں میں قانونِ شریعت کے نفاذ کی تحریکیں چلائی گئیں۔ مثلاً افغانستان، ایران، سوڈان اور پاکستان وغیرہ۔ ہر جگہ تقریباً ایک ہی قسم کی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ ہر جگہ کے مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے — حاکم اور محکوم۔ اِن دونوں گروہوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہوگیا۔ اِس کے نتیجے میں زبردست نقصان پیش آیا۔ اِن ملکوں میں شریعت کا قانون تو نافذ نہ ہوسکا، البتہ نفرت اور جبر اور تشدد کا ماحول ہر جگہ قائم ہوگیا۔

اسلامی قانون کے نفاذ کی تحریک اِس طرح الٹا نتیجہ پیدا کرنے کا سبب (counter productive) کیوں بن گئی۔ اِس کا راز یہ ہے کہ ہر جگہ نفاذِ شریعت کا نعرہ تو دیا گیا، لیکن نفاذِ شریعت کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کی پیروی نہیں کی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پیغمبر کی حیثیت سے دنیا میں 23 سال رہے۔ آپ کے مشن کا ایک پہلو یہ تھا کہ آپ عرب میں اسلامی شریعت کو نافذ کریں اور بالفعل آپ نے کامیابی کے ساتھ ایسا کیا۔ لیکن اُس زمانے کے عرب سماج میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ مسلمان، نفاذِ شریعت کے نام پر دو گروہ بن کر آپس میں لڑ رہے ہوں، جیسا کہ موجودہ زمانے میں مسلم ملکوں میں پیش آیا۔

اِس سوال کا جواب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ عائشہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ قرآن میں پہلے وہ سورتیں اُتریں جن کو مفصّل کہا جاتا ہے، یعنی وہ سورتیں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے، یہاں تک کہ جب لوگ رجوع ہو کر اسلام پر آ گئے، اُس وقت حلال اور حرام والے احکام اترے (**حتّی إذا ثاب الناس إلی الإسلام، نزل الحلال و الحرام**) اگر شروع میں یہ اترتا کہ شراب نہ پیو، تو وہ ضرور یہ کہتے کہ ہم تو شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور اگر شروع میں یہ اترتا کہ زنا نہ کرو، تو وہ ضرور یہ کہتے کہ ہم تو کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے (**صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن**)۔

اِس روایت میں ثاب کا لفظ آیا ہے۔ ثاب یثوب کے معنی ہیں: حالتِ اصلی کی طرف لوٹنا۔ مشہور عالمِ لغت راغب الاصفہانی (وفات: 1108ء) نے اِس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: رجوع الشئ إلى حالته الأولى التي كان عليها (المفردات، صفحہ 83) یعنی کسی چیز کا اپنی اُس سابقہ حالت کی طرف لوٹنا جس پر وہ پہلے قائم تھی۔

اِسی بات کو اگر لفظ بدل کر بیان کیا جائے، تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِس کا مطلب ہے — حالت فطری کی طرف واپسی۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، ہر انسان صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر ماحول کے اثر سے وہ دھیرے دھیرے اپنی اصل فطرت سے ہٹ جاتا ہے۔ اِسی کا نام بگاڑ ہے۔ صحیح معاشرہ قائم کرنے کا عمل، اِسی بگاڑ کو درست کرنے سے شروع ہوتا ہے، یعنی فطرت سے انحراف کی حالت کو ختم کرنا اور دوبارہ لوگوں کو ان کی حالتِ فطری پر قائم کرنا۔ ایک لفظ میں اِس عمل کو ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کہا جاسکتا ہے۔

حضرت عائشہ کی مذکورہ روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ — انسان کی ڈی کنڈیشننگ کر کے اُس کو حالتِ فطری کی طرف واپس لاؤ۔ جب ایسا ہوگا تو اس کے بعد انسان کے اندر احکام کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہوجائے گی، اور نفاذِ شریعت کا کام بہ سہولت انجام پاسکے گا۔ گویا کہ پیغمبر اسلام کے طریقے کے مطابق، کسی سوسائٹی میں نفاذِ شریعت کے عمل کا آغاز فکری تطہیر سے ہوتا ہے، نہ کہ قانون کے عملی نفاذ سے۔

موجودہ زمانے میں 57 مسلم ملک ہیں۔ ہر مسلم ملک میں مسلم رہنماؤں نے شریعت کے نفاذ کی تحریک چلائی، مگر لمبی جدوجہد کے باوجود کسی بھی ملک میں یہ تحریکیں اپنے مطلوب مقصد میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ ہر ملک میں اِن تحریکوں نے صرف تشدد اور جبر کی روایتیں قائم کیں۔

اِس اعتبار سے مسلم ملکوں کو دو گروپ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک قسم کے ملک وہ ہیں، جہاں حکم راں اور عوام کے درمیان پُرتشدد مقابلہ جاری ہے۔ دوسری قسم کے مسلم ملک وہ ہیں جہاں جبر کا نظام قائم ہوگیا ہے۔ یہ وہ ملک ہیں جہاں حکم راں طبقے نے نفاذِ شریعت کی تحریکوں کو

مقہور کرلیا اور جبر کے زور پر اپنی حکم رانی قائم کرلی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں حالتیں، اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مطلوب حالتیں ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ سنت کے مطابق، مسلم ملکوں میں کام کرنے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ مسلم رہنما اپنے کام کا آغاز غیر سیاسی میدان میں کرتے۔ وہ پُرامن تعلیم وتربیت کے ذریعے لوگوں کے ذہن اور ان کے کردار کو بدلتے۔

اِس تعمیری عمل کے دوران وہ ملک کے سیاسی نظام کے معاملے میں اسٹیٹس کوازم (statusquoism) کا طریقہ اختیار کرتے۔ وہ یہ پالیسی اختیار کرتے کہ سیاست اور حکومت کے معاملے کو جمہوری عمل (democratic process) کے حوالے کردیتے۔ سیاست کے معاملے میں وہ لوگوں کو موقع دیتے کہ پُرامن الیکشن کے ذریعے وہ جس کو چاہیں منتخب کریں اور پھر یہ منتخب لوگ ملک کا سیاسی نظام چلائیں۔ مسلم رہنما اگر اس دوطرفہ حکمت کو اختیار کرتے، تو یقینی طور پر ایسا ہوتا کہ بتدریج ملک کے حالات بدل جاتے۔ اِن ملکوں میں پہلے ذہن اور کردار کے اعتبار سے انقلاب آتا، اور پھر دھیرے دھیرے سیاست اور حکومت کے میدان میں بھی انقلاب آجاتا۔ مگر حکمتِ نبوی کو اختیار نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم رہ نما جو کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے، اُس کو تو وہ حاصل نہ کرسکے، البتہ انھوں نے مسلم سماج کے اندر بہت سے نئے نقصانات کا اضافہ کردیا۔

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی روایتیں آئی ہیں جن میں مسلمانوں کو شدت کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے کہ حکم رانوں میں بگاڑ کے وقت اُن کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اِن روایتوں میں شدت کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے حکم رانوں میں تم خواہ کتنا ہی بگاڑ دیکھو، تم ہرگز اُن سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار مت کرو۔ اگر تم ضروری سمجھو، تو صرف تنہائی میں نصیحت پر اکتفا کرو، عملی ٹکراؤ یا حکم رانوں کو بدلنے کی تحریکیں ہرگز نہ چلاؤ۔

عدم ٹکراؤ کی اِس پالیسی کا مطلب سرینڈر کرنا نہیں ہے۔ یہ دراصل یہ بتانے کے لیے ہے کہ سیاسی بگاڑ کے حالات میں تمھارے عمل کا نقطۂ آغاز کیا ہونا چاہیے۔ ایسے حالات میں تمھارے عمل کا نقطۂ آغاز یہ ہونا چاہیے کہ تم انتہائی حد تک پُرامن رہتے ہوئے، غیر سیاسی دائرہ کار میں لوگوں کو

ایجوکیٹ (educate) کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ یہ کوشش مسلسل جاری رکھو، یہاں تک کہ حالات اِس حد تک بدل جائیں کہ پُرامن طور پر تبدیلی ممکن ہوجائے۔

اسلام کی پالیسی ہر معاملے میں نتیجہ خیز عمل (result oriented action) کے اصول پر ہوتی ہے۔ عمل کا مثبت نتیجہ نکلے تو عمل کرو، اور اگر مثبت نتیجہ نکلنے والا نہ ہو، تو سیاست سے مکمل طور پر الگ رہتے ہوئے پُرامن اصلاح کا طریقہ اختیار کرو، اِس طریقے کو اختیار کرنے سے ہمیشہ امن قائم ہوتا ہے، اور اِس طریقے کے خلاف عمل کا نتیجہ ہمیشہ تشدد کی صورت میں نکلتا ہے۔ (2009)

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔ الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن 33 فی صد ہے۔ 50 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 40 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ 2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ 3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تین مہینے تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 150	$20
دو سال	Rs. 300	$40
تین سال	Rs. 450	$60

خودکشی کا بڑھتا ہوا رجحان

امریکا میں بیماری اور اس پر کنٹرول کے لیے ایک ادارہ قائم ہے۔ اِس ادارے کا نام یہ ہے:

US Centre for Disease Control and Prevention

اِس ادارے کے تحت جو اعداد وشمار جمع کیے گئے ہیں، اس کے مطابق، امریکا میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ مثلاً 2010 میں روڈ حادثے میں مرنے والوں کی تعداد 33,687 تھی۔ اِس کے مقابلے میں، اِسی سال امریکا میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد 38,364 تھی۔ (ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، 4 مئی 2013، صفحہ 21)

یہ معاملہ صرف امریکا کا نہیں ہے، بلکہ تمام ترقی یافتہ ملکوں کا ہے۔ جرمنی، فرانس، اسپین، جاپان اور چین ہر جگہ خودکشی کرنے والے انسانوں کی تعداد ہر سال بڑھ رہی ہے۔ اعداد وشمار کے مطابق، خودکشی کرنے والوں کی تعداد ترقی یافتہ ملکوں میں زیادہ ہے۔

ایسا کیوں ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جب مادی ترقی کا دور آیا تو انسان نے یہ سمجھا کہ اب وہ دنیا ہی میں اپنی جنت بنا سکتا ہے۔ وہ اپنی تمام خواہشوں (desires) کو آخری حد تک پورا کرسکتا ہے، مگر عملاً ایسا نہیں ہوا، بظاہر مادی ترقیوں کے باوجود انسان کو فل فل مینٹ (fulfilment) حاصل نہ ہوسکا۔

جب انسان بقدر ضرورت (need) کی سطح پر جی رہا تھا، تو اس کو فل فل مینٹ حاصل نہ تھا۔ اُس وقت اس نے سمجھا کہ جب آرام (comfort) کی سطح پر جینا نصیب ہوگا تو اس کو فل فل مینٹ حاصل ہوجائے گا، مگر ایسا نہ ہوسکا۔ پھر لگژری (luxury) کا دور آیا، مگر انسان اب بھی فل فل مینٹ (fulfilment) سے محروم تھا۔ اب انسان مایوسی کی حالت میں جی رہا ہے اور اِسی مایوسی کا ایک ظاہرہ خودکشی کی بڑھتی ہوئی رفتار ہے۔

مس ورلڈ

نونیت کور (Navneet Kaur Dhillon) چندی گڑھ میں 1992 میں پیدا ہوئی۔ بیوٹی کے ایک مقابلے میں وہ کامیاب ہوئی اور مس انڈیا کا ٹائٹل حاصل کیا۔ اب وہ مس ورلڈ (Miss World) کے مقابلے کے لیے تیاری کررہی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو پوری طرح اِس تیاری کے کام میں لگا دیا ہے۔ ایک انٹرویو کے دوران اس نے کہا کہ — میں مس ورلڈ کے تصور میں جیتی ہوں، مس ورلڈ کے تصور میں سانس لیتی ہوں، اب صرف یہ باقی ہے کہ مجھے مس ورلڈ کا تاج پہنایا جائے:

I am living, breathing Miss World; only the crowning is left.

ٹائمس آف انڈیا (2 ستمبر 2013) میں اِس خبر کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ کیا وجہ ہے کہ بہت سے لوگ مس ورلڈ اور مسٹر ورلڈ کا ٹائٹل حاصل کرنے کے لیے ہیرو، بلکہ سپر ہیرو بن جاتے ہیں، مگر یہی بے تابانہ شوق لوگوں کے اندر جنت (paradise) کے لیے نہیں ہوتا۔ دنیا میں بے شمار لوگ ہیں، لیکن اُن میں سے کوئی مس پیراڈائز اور مسٹر پیراڈائز کا درجہ حاصل کرنے کے لیے ہیرو بننے پر تیار نہیں۔

میں نے غور کیا تو خود مذکورہ رپورٹ میں اِس کا جواب موجود تھا۔ نونیت کور جو رات دن اپنی تیاری میں لگی ہوئی ہے، اُس نے اِس مقصد کے لیے اپنی بے پناہ محنت کی توجیہ کرتے ہوئے کہا — یہ ایک ایسا موقع ہے جو پوری زندگی میں صرف ایک بار آئے گا اور مجھے بہر حال اس کو حاصل کرنا ہے:

This is a once-in-a lifetime chance. I have to do it.

مس ورلڈ بننے کا چانس اُس کے لیے صرف ایک بار ہے — یہی وہ چیز ہے جو مذکورہ خاتون کو ہیرو بنائے ہوئے ہے۔ جب اُس نے دیکھا کہ اِس کا چانس میرے لیے دوبارہ آنے والا نہیں ہے تو اس کے دل میں یہ جذبہ ابھرا کہ وہ اس کی تیاری میں اپنی ساری طاقت لگا دے۔ یہی دریافت اگر کسی عورت یا مرد کو جنت کے بارے میں ہو جائے تو وہ بھی اِسی طرح مس پیراڈائز یا مسٹر پیراڈائز بن جائے گا۔

خودکشی کیوں

بالی وڈ کی ایک ایکٹرس جِیا خان نے 3 جون 2013 کو ممبئی میں خودکشی کر لی۔ اس وقت اس کی عمر 25 سال تھی۔ وہ جوہو کے ایک فلیٹ میں رہتی تھی۔ وہاں کوئی سوسائڈ نوٹ (suicide note) نہیں پایا گیا۔ فلم ڈائرکٹر رام گوپال ورما نے بتایا کہ ضیا خان کو تین سال سے کوئی کام نہیں ملا تھا۔ اس نے رام گوپال ورما سے ایک ملاقات میں کہا تھا کہ اس کے قریب کا ہر آدمی اس کو یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ ناکام ہے:

The last time I met her, Jiah told me that everyone around her makes her feel like a failure.

ضیا خان نے جو کہا، وہ خودکشی کے لیے کوئی عذر (excuse) نہیں ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ خود اپنے آپ کو دریافت کرے، نہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو ویسا سمجھے جیسا کہ دوسرے لوگ اس کو بتا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا غیر ہمدرد (unsympathetic) لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس دنیا میں حقیقی معنوں میں کوئی شخص دوسرے کا خیر خواہ (well-isher) نہیں ہوتا، حقیقی معنوں میں کوئی شخص کسی کا اعتراف (acknowledgement) نہیں کرتا۔ یہ کام آدمی کو خود کرنا ہے کہ وہ اپنے بے لاگ جائزہ سے اپنی قدر و قیمت کو متعین کرے۔ وہ اپنے ذاتی یقین پر کھڑا ہو، نہ کہ دوسروں کے ماننے یا نہ ماننے پر۔

عقل مند آدمی وہ ہے جو دوسروں کی تعریف سے خوش نہ ہو اور دوسروں کی تنقید اُس کو غمگین نہ کرے۔ دوسروں کی تعریف پر خوش ہونے والا آدمی اپنے بارے میں زیادہ اندازہ (overestimation) میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح دوسروں کی تنقید پر غمگین ہونے والا آدمی اپنے بارے میں کم تر اندازہ (underestimation) کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور دونوں قسم کا مزاج بلاشبہہ آدمی کے لیے یکساں طور پر مہلک ہے۔

کسی کی انا کو مت چھیڑیے

ہر آدمی کی ایک انا ہوتی ہے۔ کوئی آدمی اُسی وقت تک معتدل (normal) رہتا ہے جب تک اس کی انا سوئی ہوئی ہو۔ جیسے ہی آپ اس کی انا کو چھیڑیں، اس کا اعتدال ختم ہو جائے گا۔ اِسی حقیقت کا اظہار ایک انگریزی مثل میں اس طرح کیا گیا ہے— ہرگز کسی کو فار گرانٹیڈ نہ لو:

Never take someone for granted.

ہر عورت اور مرد پیدائشی طور پر انا کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ انا (ego) ہر انسان کی شخصیت کا لازمی حصہ ہے، حتی کہ ایسے افراد جو بظاہر متواضع (modest) دکھائی دیتے ہوں، وہ بھی اتنا ہی زیادہ انا کی نفسیات لیے ہوئے ہوتے ہیں جتنا کہ بظاہر غیر متواضع انسان۔ دونوں کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ پہلا شخص اُس وقت انانیت (egoism) کا کیس بنتا ہے جب کہ اس کی انا پر ضرب لگا دی جائے، جب کہ دوسری قسم کا انسان ہر وقت کبر (arrogance) کی تصویر بنا رہتا ہے۔

ایسی حالت میں سماج کے اندر عافیت کی زندگی گزارنے کا ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ آپ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بے حد محتاط رہیں اور کبھی کوئی ایسی بات اپنی زبان سے نہ نکالیں جس سے دوسرے کی انا پر ضرب پڑتی ہو۔

یہ ایک عملی حقیقت ہے کہ آدمی سماج کے اندر سب سے لڑ کر نہیں رہ سکتا۔ ایسی حالت میں سماج کے اندر باعافیت زندگی گزارنے کی ایک ہی صورت ہے، اور وہ ہے — دوسروں کے جذبات کی رعایت کرتے ہوئے اس سے معاملہ کرنا۔

اِس معاملے میں آدمی کے پاس صرف دو میں سے ایک کا اختیار (choice) ہے، یا تو دوسروں سے لڑ کر اپنی زندگی کو غیر ضروری طور پر مشکل بنا لینا، یا اپنے کو بے مسئلہ انسان (no-problem person) بنا کر دوسروں کے شر سے اپنے آپ کو بچا لینا۔ جو آدمی اپنے آپ کو بے مسئلہ بنا لے، وہ اِس سے بچ جاتا ہے کہ دوسرے انسان اس کے لیے مسئلہ (problem) بنیں۔

سوال وجواب

سوال

مسلمانوں کے زوال اور انحطاط کا بنیادی سبب کیا ہے؟ اس زوال وانحطاط کا منبع کہاں ہے۔ اصلاحِ احوال کی ہر کوشش کیوں ناکام ہوگئی۔ اور یہ سوال کہ اس زوال وانحطاط کے منبع کو بند کرنے کی تدبیر کیا ہونی چاہئے۔ کیا اس کا سب سے بنیادی سبب ہمارے بیچ کئی لاکھ حدیث ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کے دوسو سال بعد مرتب کی گئی ہے یا کوئی دوسری وجہ ہے، براہِ کرم رہنمائی فرمائیں۔ (سید ثاقب علی ہاشمی، پٹنہ، بہار)

جواب

1۔ امتِ مسلمہ کا زوال کسی پراسرار سبب کی بنا پر نہیں ہے۔ یہ ایک عام فطری قانون کی بنا پر ہے اور وہ وہی ہے جس کو ابنِ خلدون (وفات: 1406) نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے: للأقوام أعمار، کما للأفراد أعمار۔ جن گروہ کا کوئی نظریہ (ideology) نہ ہو، جس کا مقصد صرف کھانا کمانا ہو، اُس کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ عام حالات میں زوال کا شکار نہ ہو، لیکن ایسا گروہ جو ایک نظریہ یا آئڈیالوجی کی بنیاد پر بنے، اُس کے لیے ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی بعد کی نسلوں میں نظریاتی ضعف آجاتا ہے۔ وہ ایک نظریاتی گروہ کے بجائے صرف ایک قومی گروہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اِسی حالت کا نام زوال ہے۔

یہی موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا حال ہوا ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں اسلام بطور نظریہ یا اسپرٹ باقی نہیں رہا، اب وہ صرف ایک کلچر کے طور پر باقی ہے، جیسا کہ زوال یافتہ قوموں کے درمیان ہمیشہ ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمان ایک کلچرل گروپ کی حیثیت سے زندہ ہیں، نہ کہ ایک نظریاتی گروپ کی حیثیت سے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے درمیان بہت سی اصلاحی تحریکیں اٹھیں، مگر وہ سب کی سب اپنے نشانے کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ اِس ناکامی کا سبب یہ تھا کہ موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اِس مفروضے کے ساتھ اپنا کام شروع کیا کہ یہاں ایک ''خیرِ امت'' موجود ہے اور اس کو

زندہ کرنے کے لیے صرف یہ کرنا ہے کہ اس کے اندر جوش وولولہ پیدا کر دیا جائے۔ اقبال کا یہ شعر اِسی ذہن کی نمائندگی کرتا ہے:

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی　　حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

احیاءِ امت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اِس بات کو تسلیم کیا جائے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان خیر امت نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک زوال یافتہ امت (degenerated community) ہیں۔ اِس اعتراف کے بعد آپ کو صحیح نقطہ آغاز مل جائے گا، یعنی لوگوں کے اندر سب سے پہلے ایمانی شعور پیدا کرنا۔ مزید یہ کہ اصلاحِ امت کا کام اصلاحِ افراد سے شروع ہوگا، اِس طرح نہیں کہ مسلمانوں کی بھیڑ جمع کر کے اسٹیج سے اُن کے سامنے پر جوش تقریر کی جائے۔ یہ بھی صحیح آغاز نہیں کہ اسلام کے نام سے بڑے بڑے ادارے یا مسلم حکومتیں قائم کی جائیں۔ اِس قسم کی کوششوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے دیمک زدہ لکڑی پر کوئی عمارت کھڑی کرنا۔ ایسا منصوبہ اِس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

بعض جماعتوں نے اصلاحِ ایمان کے نام سے تحریکیں چلائیں، لیکن اصل نشانے کے اعتبار سے وہ بھی ناکام ہوگئیں۔ اِس ناکامی کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے فضائل کی کہانیاں سنا کر امت کو بیدار کرنا چاہا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے امانی (2:78) کی بنیاد پر کسی قوم کو اٹھایا جائے۔ مگر فضائل کی کہانیوں یا امانی کی داستانوں کے ذریعے کسی زوال یافتہ قوم کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا۔

زوال یافتہ امت کو دوبارہ زندہ کرنے کا صحیح طریقہ وہ ہے جو کہ مبنی بر افراد ہو، نہ کہ مبنی بر قوم۔ اِس طریقے کو قرآن میں بتا دیا گیا ہے۔ اِس کو سمجھنے کے لیے آپ قرآن کی سورہ الحدید کی آیت 17 کا مطالعہ کیجئے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب ''قیادت نامہ''، صفحہ: 183-180)۔

2۔ حدیث کی بنیاد پر مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا ہونا کوئی مسئلہ نہیں ہے، نہ اُس کا کوئی تعلق زوالِ امت سے ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''تجدید دین''، صفحہ 38-21) حقیقت یہ ہے کہ اختلاف ایک امرِ فطری ہے، وہ ہمیشہ ہوگا، اختلاف خالق کے تخلیقی منصوبے کا لازمی حصہ ہے۔

اختلاف کو ختم کرنا کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ اختلاف کی موجودگی نہیں ہے، بلکہ برداشت کی عدم موجودگی ہے۔ زوال یافتہ نفسیات کی بنا پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا حال یہ ہوا ہے کہ وہ اختلاف کو ڈسکشن کا موضوع نہیں بناتے، اختلاف پیش آتے ہی وہ برہم ہوجاتے ہیں، یہ برہمی اتنی زیادہ بڑھتی ہے کہ ٹکراؤ اور جنگ کی نوبت آجاتی ہے۔ اگر آپ کو مسلمانوں کی اصلاح کرنا ہے تو اختلاف کے خاتمے کی ناممکن الحصول کوشش نہ کیجئے، بلکہ اُن کے اندر برداشت اور تحمل کی صفت پیدا کیجئے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اختلاف ان کے لیے رحمت بن گیا ہے۔ اختلاف کو اگر ڈسکشن (discussion) کا موضوع بنایا جائے تو اِس سے ذہنی ارتقا ہوتا ہے اور اگر اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو اختلاف تو ختم نہ ہوگا، البتہ قوم برباد ہوکر رہ جائے گی۔

سوال

میں ماہ نامہ الرسالہ کا ایک عرصۂ دراز سے مستقل خریدار اور قاری ہوں۔ آپ کی تحریر کردہ بہت سی کتابیں میں نے پڑھی ہیں۔ زکوۃ کے مصارف میں ''فی سبیل اللہ'' کی مد میں ''تملیک'' کے ذریعہ زکوۃ اور فطرہ وغیرہ کی رقم کا استعمال ایک عام بات ہوگئی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں آپ جیسا عالمِ دین ہی غیر جانبداری کے ساتھ ایک تحقیقی مقالہ یا کتاب اِس موضوع پر تحریر کرسکتا ہے جس میں تملیک کی تعریف، شرعی حیثیت، ابتدا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں تملیک کی موجودگی اور اس پر عمل آوری جیسے سوالات کا تشفی بخش جواب تحریر ہو اور غیر جانبدارانہ تجزیہ بھی ہو۔ (اقبال حسین، اجین، مدھیہ پردیش)

جواب

زکات کے موضوع پر کافی لکھا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں میں آپ کو تین کتابیں پڑھنے کا مشورہ دوں گا— زکات کا اجتماعی نظام (مولانا ابوالکلام آزاد)، فقہ الزکات (ڈاکٹر یوسف القرضاوی)، مسئلہ تملیک کی شرعی حیثیت (مولانا شہاب الدین ندوی)۔

زکات کے معاملے میں ''لامِ تملیک'' کی بحث صرف ایک فنی بحث ہے، اس کی بنیاد قرآن اور حدیث کے کسی واضح حکم پر مبنی نہیں ہے۔ جن علمانے لامِ تملیک کا مسئلہ وضع کیا ہے، وہ اُن کا صرف ذاتی استنباط ہے اور استنباط کے معاملے میں ہمیشہ اختلاف کی گنجائش رہتی ہے۔ آپ کو یہ حق ہے کہ آپ چاہیں تو اِس استنباط کو مانیں، یا اگر آپ کے پاس کوئی دلیل شرعی موجود ہو تو آپ جائز طور پر یہ حق رکھتے ہیں کہ آپ اِس استنباط کو نہ مانیں۔

خود ماہ نامہ الرسالہ میں اِس موضوع (زکات کا مسئلہ) پر ایک مضمون چھپ چکا ہے۔ آپ اس کو بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں (ماہ نامہ الرسالہ، جنوری 1997، صفحہ: 18-14)۔

سوال

عرض ہے کہ میں نے جولائی 2013 کا الرسالہ ملاحظہ کیا۔ ہمیشہ کی طرح معنی خیز اور علمی باتوں سے مزین ہے اور ہمیشہ کی طرح کچھ نہ کچھ اختلافی باتیں ذہن میں کھٹک پیدا کرنے والی ہیں۔ آپ نے تبلیغی جماعت کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تحریک لوگوں کو نماز پر کھڑا کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی اور بعد کو اس میں غلو اور تعصب آ گیا (صفحہ: 15)۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ نے اس کا تعارف غلط پیش کیا ہے۔ مولانا الیاس کے بقول، وہ اِس تحریک سے یہ چاہتے تھے کہ امت اُسی سطح پر آ جائے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو چھوڑ کر گئے تھے۔ یہ آپ کے قول کے برخلاف، ایک ہمہ گیر عنوان ہے جو اُسی فکر و منہج کے ساتھ اب تک چلا آتا ہے اور انشاء اللہ چلتا رہے گا۔ کچھ لوگوں کے ذاتی کردار کو کسی تحریک پر تبصرہ کی شکل میں پیش نہیں کیا جا سکتا، ٹھیک اُسی طرح جیسے کوئی مسلمانوں کے اعمال سے اسلام پر تبصرہ کرے۔ میں ایک سال کی جماعت سے حال ہی میں لوٹا ہوں، میں نے اِس شجر کی کچھ شاخوں کو تو باغی ضرور پایا ہے، لیکن جڑیں معمولی تغیر کے ساتھ اب بھی مضبوط ہیں، اور اگر آپ کی نظر میں کوئی چیز غلط ہے تو اس کی وضاحت کریں۔ (عبدالحسیب، کیرانہ، یوپی)

جواب

تبلیغی جماعت کے بارے میں الرسالہ میں جو بات میں نے لکھی ہے، وہ کوئی ذاتی رائے نہیں ہے۔

مولانا انعام الحسن کاندھلوی (وفات: 2006) جو تبلیغ میں تیسرے ''حضرت جی'' کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ مبینہ طور پر کہتے تھے کہ تبلیغی تحریک ایک مسجد وار تحریک ہے۔ مولانا انعام الحسن کاندھلوی کا یہ بیان کوئی مخفی بیان نہیں ہے، تبلیغ کے سبھی لوگ اس سے واقف ہیں۔

دوسری بات یہ کہ میں خود جماعت میں گیا ہوں۔ میں نے اپنے ذاتی تجربے میں یہی پایا ہے کہ ہر بار مسجد میں ایک ہی قسم کی باتیں کہی جاتی ہیں۔ ایک ہی قسم کی کتاب پڑھ کر ہمیشہ سنائی جاتی ہے اور تقریر میں ہمیشہ تقریباً ایک ہی قسم کی باتیں کہی جاتی ہیں۔ میں نے الرسالہ میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک واقعہ ہے، وہ کوئی ذاتی تبصرہ نہیں۔

غلو کی بات جو میں نے لکھی ہے، وہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے۔ مجھ سے بہت سے لوگوں نے یہ بات کہی کہ تبلیغی جماعت میں غلو کا مزاج آ گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں، وہ اس کے مخالف نہیں۔ غلو کیا چیز ہے۔ غلو دراصل جمود (stagnation) کا نام ہے اور یہ ظاہرہ ہر تحریک میں بعد کو پیدا ہو جاتا ہے۔ تبلیغی جماعت اِس معاملے میں کوئی مستثنیٰ جماعت نہیں۔

آپ نے مولانا الیاس کاندھلوی (وفات: 1944) کے جس ملفوظ کا ذکر کیا ہے، وہ ملفوظ بجائے خود درست ہوسکتا ہے، لیکن تحریکیں کسی ملفوظ پر نہیں چلتیں، تحریکوں کے ارتقا کے اپنے اسباب وعوامل (factors) ہوتے ہیں۔ یہی اسباب وعوامل ہیں جو تحریکوں کے حال اور مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں، نہ کہ کوئی ملفوظ۔

سوال

1980 کے شروع کا کوئی مہینہ ہوگا جب میں نے الرسالہ اور مولانا صاحب کی بعض تصانیف دیکھی تھیں۔ پہلے میں نے الرسالہ کی ایک کاپی اٹھائی اور اس کے اوراق الٹ پلٹ کر کے دیکھا تو اس میں اس وقت چند آیتوں کا ترجمہ اور تفسیر تھی جو میں نے پڑھی اور کافی پسند آئی، پھر میں نے وہ الرسالہ خرید لیا اور اس وقت سے لے کر آج تک الرسالہ خریدتا آ رہا ہوں اور بغور پڑھتا آ رہا ہوں۔ الرسالہ ہاتھ میں آنے کے بعد جب تک اس کو پڑھ کر مکمل نہ کرلوں، چین نہیں ملتا۔ الرسالہ کے ساتھ ساتھ

مولانا صاحب کی دیگر تصانیف میں سے 70% کتابیں بھی منگا کر پڑھ چکا ہوں۔ اس وقت مطالعہ میں جو کتاب چل رہی ہے، وہ ہے ''کتاب معرفت''۔ میری تعلیم بہت کم ہے، لیکن الرسالہ کے مسلسل مطالعے سے جو میں نے اثرات قبول کئے، وہ درج ذیل ہیں۔

1۔ سب سے پہلا الرسالہ پڑھ کر محسوس کیا کہ الرسالہ میرے احساس کی علمی پیاس بجھانے والا ایک ذریعہ ہے۔ الرسالہ کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے میں ہر دینی اجتماع میں شریک ہو کر دینی باتیں سنتا تھا، مگر علمی ذوق تشنہ رہتا تھا۔ جب الرسالہ کے ساتھ ساتھ دیگر کتابیں بھی پڑھ لیں تو ایسا لگا کہ اب تلاش حق کا ذریعہ الرسالہ اور مولانا کی دیگر تصانیف ہیں۔ الرسالہ کا مطالعہ کرنے سے پہلے میرا ذہن بند تھا اور پھر محسوس ہوا کہ الرسالہ سے پہلے حق کی پگڈنڈیوں پر چل رہا تھا اور اب شاہ راہ پر چلنے لگا ہوں۔

2۔ الرسالہ کا مطالعہ کرنے پہلے میرے ذہن کی یہ حالت تھی کہ میں اگر کسی موضوع پر غور کرتا تو کچھ سوچنے کے بعد میرا ذہن آگے سوچنے سے رک جاتا تھا۔ اور ایک طرح کی پریشانی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن جب سے الرسالہ پڑھنا شروع کیا، آہستہ آہستہ میرا ذہن کھلتا گیا اور کسی بھی بات پر غور کرنا آسان ہوتا گیا، یہاں تک کہ اب کوئی بھی بات یا مسئلہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ میں نے صرف الرسالہ پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ میں نے آپ کی دیگر تصانیف کا بھی مطالعہ کیا۔ جیسے ''الاسلام''، ''تجدید دین'' وغیرہ۔

3۔ ہر ماہ کے الرسالہ کا انتظار رہتا ہے اور ملتے ہی پڑھنا شروع کر دیتا ہوں اور جب تک ختم نہ کرلوں، چین نہیں ملتا۔ یہی حال باقی کتابوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

4۔ الرسالہ کے مطالعہ سے دین اور دنیا کی اہم معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔

5۔ الرسالہ کو مسلسل پڑھتے رہنے سے خود ایسا احساس ہوتا ہے کہ آپ خود بھی ڈگری یافتہ ہو گئے ہیں۔ جن حضرات نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی ہو، وہ مولانا کا لٹریچر پڑھیں۔

6۔ الرسالہ کے مطالعہ سے ذہن کا ارتقا ہوتا ہے۔ ذہن میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اور ہم خود ہی غور فکر کرنے لگتے ہیں۔

7۔ الرسالہ کے مسلسل پڑھتے رہنے سے آدمی اپنی گفتگو میں مثبت انداز اختیار کرتا ہے۔

8- الرسالہ کے متواتر مطالعہ سے اپنے اندر کی جھجھک بھی دور ہوجاتی ہے۔ کسی مسئلہ پر چند صاحبان کے درمیان خود بھی کچھ بولنے کی ہمت پیدا ہوجاتی ہے۔

9- الرسالہ کے پڑھنے والوں کے اندر سنجیدگی پیدا ہوجاتی ہے۔

10- الرسالہ پڑھنے والے حضرات لایعنی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنے آپ خاموشی سے غور وفکر میں مشغول ہوتے ہیں الرسالہ کا مشن ہی یہ ہے کہ ہر مسلمان آخرت پسند بنے۔

11- الرسالہ کے لگاتار پڑھنے سے سب سے بڑا فائدہ قرآن وحدیث کی تفسیر پڑھنے سے ملتا ہے۔ گویا الرسالہ کے مطالعہ سے ہم تفسیر کا مطالعہ بھی جاری رکھے ہوتے ہیں۔

12- الرسالہ کے مسلسل مطالعے کے ذریعہ ہمارے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جوابات بھی ملتے رہتے ہیں۔

13- الرسالہ کے مسلسل مطالعے سے اپنی اردو کے ساتھ انگریزی بھی ٹھیک ہوجاتی ہے۔ جن الفاظ کے معنی ہم ڈکشنری میں نہیں دیکھ سکتے، وہ الرسالہ میں مل جاتے ہیں۔

14- ڈگری یافتہ حضرات کے لئے صرف ڈگری کافی نہیں ہوتی، ان کو چاہئے کہ وہ کسی عالمِ دین کے لٹریچر کا مطالعہ کریں۔ مطالعہ کے لئے مولانا صاحب کا لٹریچر بہترین لٹریچر ہے۔ ساتھ میں الرسالہ کا بھی مطالعہ جاری رکھیں۔

آخر میں مولانا صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے الرسالہ کے ذریعے اور اپنی تصانیف اور لٹریچر سے ہم کو ایک اچھا مسلمان اور ہندستان کے لئے ایک اچھا شہری بننے میں بہت مدد دی ہے۔ (سرفراز الدین، ٹیلر ماسٹر، بنگلور)

جواب

یہ تحریر اِس بات کی ایک اچھی مثال ہے کہ دعوت کا نشانہ عمل متلاشی افراد (individual seekers) ہیں، نہ کہ بھیڑ ایکٹوزم (crowd activism)، یعنی متلاشی افراد کو لے کر اُن پر محنت کرنا، نہ کہ بھیڑ اکٹھا کرکے اُن کے سامنے تقریریں کرنا۔

ہر سماج میں ایسے افراد موجود ہوتے ہیں جن کے اندر روحِ تجسس (spirit of inquiry) پائی جاتی ہے، جو افکار کے جنگل میں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ سچائی کیا ہے۔ دعوت کا عمل ابتداءً عمومی انداز میں شروع ہوتا ہے، لیکن اِس عمل کا مقصد متجسس افراد کو دریافت کرنا ہے۔ جب داعی کو ایسے افراد مل جائیں تو اس کو چاہئے کہ وہ ایسے افراد پر اپنی ساری طاقت خرچ کرے۔

اِس معاملے میں داعی کا مزاج چیونٹی جیسا مزاج ہوتا ہے۔ چیونٹی جب کسی ڈھیر کو پاتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتی کہ وہاں دوسری کیا کیا چیزیں موجود ہیں۔ وہ صرف شکر (sugar) کے دانوں کو دیکھتی ہے اور اپنی پوری توجہ شکر کے اِنھیں دانوں پر لگا دیتی ہے۔ یہی داعی کا طریقہ ہے۔ داعی کو چاہئے کہ وہ اِسی چیونٹی کلچر کو اختیار کرے۔

اجتماعی حالات خواہ کتنے ہی زیادہ بگڑے ہوئے ہوں، لیکن ہر سماج میں متلاشی حق افراد ضرور موجود ہوتے ہیں۔ ایسے ہی افراد داعی کا اصل سرمایہ ہیں۔ یہ افراد تعلیم یافتہ بھی ہو سکتے ہیں اور غیر تعلیم یافتہ بھی۔ وہ سند اور ڈگری رکھنے والے بھی ہو سکتے ہیں اور سند اور ڈگری نہ رکھنے والے بھی — مذکورہ خط اِس معاملے کی ایک اچھی مثال ہے۔

صدر اسلامی مرکز کے آڈیو اور ویڈیو لیکچرز کے لیے حسب ذیل ویب لنکس ملاحظہ ہوں:

www.cpsglobal.org/videos.

www.alquranmission.org/podcasts.aspx.

Rahnuma-e-Zindagi
by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Tuesday-Friday 5.00 am

ISLAM FOR KIDS
by
Saniyasnain Khan/Maria Khan
ETV Urdu
Every Sunday 9.00 am

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2012-14
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2012-14

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

www.goodwordbooks.com